عمر اتنی تو عطا کر مِرے فن کو خالق
میرا دشمن میرے مرنے کی خبر کو ترسے

فہرست

غزلیں، نظمیں:-

انتساب

محفلِ شامِ غریباں کے چراغوں کا دُھواں!
مقتلِ عِشق و جلوُسِ غمِ ایّام کے نام !

شورشِ کُنجِ قفس، نذرِ شہیدانِ وفا
صُبحِ اِعزاز کی ساعَت، شبِ الزام کے نام

موسمِ دِید، تری جُنبشِ اَبرو پہ نِثار
سجدہء اھلِ وفا، تیرے دَر و بام کے نام،

میری پلکوں پہ سُلگتی ہوُئی صَدیوں کے نجوم
تیری زُلفوں سے مہکتی ہوُئی اِک شام کے نام،

میرے بُجھتے ہوُئے ہونٹوں پہ غزل کی خواہش
تیری آنکھوں پہ اُترتے ہوُئے الہَام کے نام

ناتمام سچ کی دستاویز

جس دور کا اَدب اپنے رگِرد وپیش میں بکھری ہُوی زندگی اور اُس کی جراحتوں سے بے خبر اور اپنے عصری تقاضوں سے بے نیازی کا گُنہگار رہو وہ اتنی دیر تک سانس لے سکتا ہے جتنی دیر کچے رنگوں سے بنی ہوُئی کوی تصویر مُسلسل بارش میں اپنی ہیّت برقرار رکھ سکتی ہے۔ یا آوازوں کے شُور میں کوئی کمسن اور ادھوری لَے اپنے ''ہونے'' کا احساس دلائے بغیر ہَوا کی مَوج میں گُم ہو کر رہ جاتی ہےَ۔ کیونکہ ہَر دَور اپنے اَدب کے خدوخال کی شکست وریخت کا ذمہّ وار بھی ہوتا ہےَ اور اُس کے کردار وعمل کا نگران ومحتسب بھی، اسی طرح ہَر دور کا اَدب اپنے عہد کے چہرے پر خفی وجلی خراشوں کا مصوّر بھی ہوتا ہے، چارہ گر بھی۔

جہاں تک فنکار کے معاشرتی حقوق و فرائض اور جبلّی محرّکات کا تعلّق ہے۔ یہ بات سراسر اُس کی تخلیقی صلاحیتوں اور قلبی اِحساسات پر منحصر ہے۔ کہ وہ اپنے عہد کی وسعتوں میں کتنی دُور تک اور کتنی دیر تک دیکھ سکتا ہے، اس کی سوچ کی گہرائی اور شعوُر کی پختگی پیش منظر اور پس منظر کی کتنی پرتیں اُلٹ سکتی اور اپنے عہد کے انسان کے چہرے پر سے کتنی نقابیں اُٹھا سکتی ہےَ؟

زندگی کے صحرا میں اپنے فگار پاؤں کے آبلوں سے پھُوٹتے لہوُ کے گُلاب کھلانے والا یہ تشنہ لَب رَہرو اپنے جسم پر صَدیوں کی تھکن اَوڑھے اور مجرُوح اعصاب پر مسافتوں کی رِدا لپیٹے تپتے ہوئے دشتِ بے کراں کے ذرّے شمار کرنے میں مصروف ہےَ۔ وہ زِندگی کا جزوِکم نشاں نہیں خُود زندگی ہےَ، وہ بگولوں کا ہمسفر اور ہواؤں کا ہم مزاج ہوتے ہوئے بھی اپنے بعد میں آنے والے رہ نوردوں کے لیے راستے تراشتا اور منزلوں کی جستجو میں اشکوں کے چراغ لُٹاتا رہتا ہے۔

وہ بظاہر بے اثاثہ مگر بباطن متاعِ حیات کا امین اور توانا روشنیوں کا دیانت دار پیغام بَر ہے۔ وہ صحیح معنوں میں اپنے عہد کے تاریخی شعوُر کا عکّاس اور اپنے دَور کی فِکری شکستگی کا مرثیہ خواں ہَے۔

اس لئے ہم کسی بھی عہد کا کردار اُس کے نمائندہ فنکار کی نظریاتی صداقتوں کی گواہی کے بغیر متعیّن نہیں کر سکتے اور نہ ہی کسی فنکار کے تخلیقی سفر کا زائچہ اُس کے عہد سے الگ کر کے ترتیب دے سکتے ہیں۔

یہ طَے شُدہ اَمر ھے کہ کِسی بھی دَور کا سچّا اور کھرا فنکار اپنی زندگی کے لئے اپنے عہد کی تاریخ سے لفظوں کی سانسیں مستعار نہیں لیتا اور نہ ہی اپنے عصَر کے جغرافیائی پیمانوں سے اپنے فنی قدوقامت کا اندازہ لگاتا ہَے۔ فنکار اپنی ذات میں کائنات ہے اور کائنات کو اپنی ذات کی تجلیوّں سے منوّر و مُستیز کرنا اُس کی فطرت میں شامل ہَے۔ وہ موٴرخ کے قلم سے ٹپکتی ہوُئی روشنائی میں بھی اپنے اندر کے کرب آمیز سچ کی شُعاعیں کھولنے کا متمنی رہتا ہَے۔

تاریخ اُس سے تہذیب کا اِشارہ لینے کی مقروض ہَے اور جغرافیائی حدُود و قیود سے ماوارہ کر ہر خِطہّ کے اِنسان کے سچّے جذبوں کی ترجمانی کرنا اُس کا منصب ہے، ذات، رنگ، نسل اور قبیلہ اُس کے نزدیک افراد کی خود تراشیدہ ترجمانی ہیں اور طبقاتی تضاد اِنسانی عظمت کو گہنا دینے کے عمل کا استعارہ ہَے۔

فنکار آدم کی بجائے آدمیت اور ذہن کی بجائے ذہنیت کا قائل ہوتا ہَے۔ اُس کا فن کائنات اور ذات کے درمیان مُسلسل رابطوں کا ''مُشترکہ اعلامیہ'' ہَے، جسے وہ اپنی عاقبت گری کا حیِلہ اور وسیلہ جانتا ہَے۔

گروھی تعصّبات مذہبی منافرت، نَسلی منافقت اور طبقاتی مناقشت نسلِ انسانی کی اِکائی اور بنی آدم کے ذہنی اِرتقا کے آئینہ خانے میں دراڑیں ڈال دینے والے عوامل ہیں۔ یہ عوامِل

کائنات کی تہذیبی توانائیوں میں خلل انداز تو ہو سکتے ہیں، مگر اِنسان کی فِطری عظمت کو فنا آلود نہیں کر سکتے، کہ اِنسان کائنات میں کی رفعتوں کا مُصدِق، فطرت کی تجلیوّں کا سفیر اور فنکار ''اِنسانیت کے معجزوں کا مظہرِ اعظم ہَے۔

اور جب کوئی فنکار عارضی نام و نمود کی خاطر یا ذاتی تشہیر کے لئے چھوٹی چھوٹی گروہی سازشوں میں اپنے آپ کو مُبتلا کر لیتا ہَے تو مُجھے یوُں لگتا ہَے، جیسے کوئی سمندر خُود سے ''رود کوہی'' میں سمٹ کر رہ گیا ہو یا آسمان ''جزیروں'' میں تقسیم ہو گیا ہو۔ اور یہ تقسیم اَدب میں کسی ''سانحہ'' سے کم نہیں ہوتی،

فن کار عام اِنسان کی سوچ سے کہیں زیادہ قد آور شخصیت کا حامل ہوتا ہَے، وہ اپنے عہد کی جہالتوں کے خلاف روشنی کی بغاوت کا علم بردار، بے حسی کے مقابل زندگی کی علامت اور سطحی سوچ کے دُھندلکوں میں ادراک کی حرارت کا استعارہ ہَے، اُسے اپنے منصب اور مرتبے کا اِحساس ہونا ضُروری ہَے، ورنہ وہ اپنے ہی اندیشوں کے بس میں اُلجھ کر دَم توڑ دے۔

زندگی سے بھرپُور ''فن'' کے جَھرنے ظُلمت و نُور، نام و نَسب، تاریخ جُغرافیہ اور تہذیب و تمدّن کی پرواکئے بغیر کِسی بھی حسّاس انسانی ذہن سے پھُوٹ سکتے ہیں۔

تخلیق شعوُر کا فیصلہ ہَے اور شعوُر کے فیصلے۔ زہنی فاصلوں کے محتاج نہیں ہوُا کرتے۔ ویران بستیوں کی کچّی مٹی کی کنواری باس کو اپنے لہوُ میں کھپا کر محرومیوں کی طویل رات کے دامن میں جلتے ہوُئے کم نفس چراغ کے آخری ہچکی کے سائے میں اپنی بجھتی آنکھوں کا آخری آنسوُ کھُردرے کاغذ کے سینے میں انڈیلنے والا فنکار بھی اُتنا ہی معتبر اور محترم ہے جتنا قابلِ تعظیم وہ تخلیق کار، جو روشنیوں سے اَٹے شہر کی رنگ و نکہت سے دہکتی مہکتی فضاؤں کی دُھوپ چھاؤں میں جذبہ و احساس کا جَلترنگ چھیڑ کر ہوَاؤں کی برہنگی کو لفظوں، لکیروں اور رعنائیوں کی پوشاک عطا کرتا ہے۔

سچ ہر حال میں سچ ہے۔ وہ صدیوں پہلے کے سُقراط کی زبان پر ہو یا آج کے محروم نوا فنکار کے زخمی سینے میں۔ وہ یوُں کہ سچ ''زندگی'' ہے اور زندگی کی توانائی پاتال کے گُونگے پانیوں اور سینۂ کُہسار سے پھُوٹتے مُنہ زور جھرنوں کے شور کو یکساں طور پر اعتماد سے نوازتی ہے۔ سچائی اور توانائی کے لئے کوہسار کی بلندی اور پاتال کی گہرائی کے درمیان حدِّ امتیاز قائم کرنا توہین صداقت و حرارت ہے۔

ریزہ حرف بھی محرومیوں کی طویل رات میں میری دُکھتی آنکھوں سا ے پھُوٹتے اشکوں اور سینے میں تیر بن کر ٹوٹتی ہوئی خواہشوں اور جھُنجھلاتے چیختے جذبوں کے ناتمام سچ کی غیر مُکمل ''دستاویز'' ہے۔ ایک ایسی دستاویز جو میرے عہد کے خوابوں، خیالوں، جراحتوں اور جسارتوں کا حلف نامہ بھی ہے اور میرے عصری تقاضوں کا ''اعزازیہ'' بھی۔

میں جانتا ہوں کہ فن کسی کی میراث نہیں اور یہ بھی مانتا ہوں کہ حرف و آہنگ کی عدالت اور نقد و نظر کی میزان میں فنکار کا نام و نسب نہیں بلکہ اُس کے فنی کردار اور فکری قد و قامت کو پوُچھا، پرکھا، تولا اور آزمایا جاتا ہے۔

مُجھے یقیں ہے کہ ''عصری استحصال'' کی مسموُم آندھی وقتی طور پر تو کسی ''صاحب فن'' کی ذہنی مشقت اور فکری ریاضت کی شاخِ شاداب کو بے ثمر کر سکتی ہے، مگر ادب میں بھی ''حساب کا دن'' معین ہے۔ حِساب کا دِن جو بے رحم ساعتوں کے اٹل فیصلوں سے عبارت ہے۔!!

اور یہی یقین میرا اثاثۂ فن ہونے کے ساتھ ساتھ مُجھے اضطراب سے اطمینان تک کے سفر کی بشارت دیتا ہے۔ اس لئے میں اپنے ہمسفروں کے ساتھ بھٹکتی آنکھوں اور لغزیدہ قدموں کی تھکن کے باوجود مکمل اعتماد سے کسی نئی جہت کا سراغ لگانے کے لئے طویل رات کی تنہائیوں کے ریگزار میں آبلوں کے چراغ جلاتا اور آنسوؤں کے آبگینے لٹاتا رہتا ہوں کہ

ناشناسائی کے اِس بے کنار صحرا میں کوئی ایک ریزہء حرف مُجھے اپنی ذات کے پہلے کشف سے آشنا کر دے تو بھی میں سمجھوں گا کہ میری مشقّت رائیگاں نہیں گئی۔

مُجھے اپنے جذبوں کی کم نمائی اور تجربوں کے ادھورے پَن کا احساس اپنے بارے میں کسی قِسم کی خوش فہمی میں مبتلا ہونے سے بچائے رکھتا ہے اور احساس کی یہ جِدت میرے فن کی تکمیل اور ارتقا کی صراطِ مُستقیم کا وہ پا گداز سفر ہَے جِس پر چلتے ہوُئے کبھی کبھی تو مُجھے اپنی سانس تک روکنا پڑتی ہے۔

میں سخاوتِ حلقہءدوستاں سے زیادہ ملامتِ صفِ دُشمناں کا مقروض ہوں کہ یہی قرض مُجھے ہر لمحہ اپنے آپ اِیذا پسندی اور آفاقی دِل شکستگی سے روشناس کرتا ہَے۔
پھر میری ذات کے برزخ میں عافیت کوشی اور اندمال خواہی کی جستجو کیسی؟

مُجھے اپنے فن کی تحسین وتنقید کے سِلسلے میں اپنے عہد کے مہیب سکوت سے بھی شکوہ کرنا نہیں آتا۔ کہ گُم سُم اور بانجھ زمینوں میں نطق ولب کے خیام نصب کرنا مُجھے وراثت میں مِلا ہَے۔

بھر حال میرا سفر ''فراتِ ذات'' سے کُچھ دُور احساس کے جلتے ہوئے خیمے سے اُٹھتے دُھویں کی لکیر سے مِلتا ہے یا مُنہ زور ہواؤں کے مقابل طاقِ تنہائی میں جَلتے ہوُئے اکیلے چراغ کی شعاع کا سفر۔!

اس سفر میں آپ مُجھے تلاش کریں یا میرا ساتھ دے سکیں تو شاید کُچھ دیر کو میری تنہائی بہل جائے۔ ورنہ رات کے پچھلے پہر کا مہیب سنّاٹا تو مُجھے قبول کرنا ہی ہَے!! اور یہ سنّاٹا مُجھ سے پہلے فنکاروں نے تو مُجھ سے بھی کہیں زیادہ پہنا اور اوڑھا تھا۔ مَیں اس سے خوف کیوں کھاؤں؟

یوُں بھی آوازوں کے بھنور میں ڈوب جانے سے سناٹا پہن کر کائنات پر محیط ہونے میں زیادہ ''معنویت'' پوشیدہ ہے۔!!

مُحسن نقوی

۲۷ دِسمبر۱۹۸۵

نجف ریزہ

۱۹۲۔نشتر بلاک

علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

اے مرے کبریا .....!

اے انوکھے سخی!

اے مرے کبریا!!

میرے ادراک کی سرحدوں سے پرَے

میرے وِجدان کی سلطنت سے اُدھر

تیری پہچان کا اوّلیں مرحلہ!

میری مٹّی کے سب ذائقوں سے جدُا!

تیری چاہت کی خوشبو کا پہلا سفر!!

میری منزل؟

تیری رہگزر کی خبر!

میرا حاصل؟

تری آگہی کی عطا!!

میرے لفظوں کی سانسیں

ترا معجزہ!

میرے حرفوں کی نبضیں

ترے لطف کا بے کراں سِلسلہ!

میرے اشکوں کی چاندی

ترا آئینہ!

میری سوچوں کی سطریں

تری جستجو کی مُسافت میں گم راستوں کا پتہ!

میں مسافر ترا......(خود سے نا آشنا)

ظلمتِ ذات کے جنگلوں میں گھِرا
خود پہ اوڑھے ہوئے کربِ وہم وگماں کی سُلگتی ردا
ناشناسائیوں کے پرانے مرض،
گمرہی کے طلسمات میں مبتلا
سورجوں سے بھری کہکشاں کے تلے
ڈھونڈتا پھر رہا ہوں ترا نقشِ پا.......!!
اے انوکھے سخی!
اے مِرے کبریا!!

کب تلک گمرہی کے طلسمات میں؟
ظلمتِ ذات میں
ناشناسائیوں سے اَٹی رات میں
دل بھٹکتا رہے
بھر کے دامانِ صد چاک میں بے اماں حسرتوں کا لہُو
بے ثمر خواہشیں
رائیگاں جستجو!!
اے انوکھے سخی!
اے مرے کبریا!!
کوئی رستہ دکھا
خود پہ کُھل جاؤں مَیں
مجھ پہ اَفشا ہو "تو"
اے مرے کبریا!!
کِبریا' اب مجھے
لوحِ ارض وسَما کے سبھی ناتراشیدہ' پوشیدہ
حرفوں میں لپٹے ہوے

اِسم پڑھنا سِکھا
اے انوکھے سخی!

اے مرے کبریا!
مَیں مسافر تِرا

☆

کہاں تھا اتنا عذاب آشنا مرا چہرہ؟
جلے چراغ تو بجھنے لگا ۔ مرا چہرہ!

وہ تیرے ہجر کے دن وہ سفیر صدیوں کے
تو ان دنوں میں کبھی دیکھتا مرا چہرہ

جدائیوں کے سفر میں رہے ہیں ساتھ سدا
تری تلاش، زمانے، ہوا، مرا چہرہ

مرے سوا کوئی اتنا اُداس بھی تو نہ تھا
خزاں کے چاند کو اچھا لگا مرا چہرہ

کتاب کھول رہا تھا وہ اپنے ماضی کی
وَرق وَرق پہ بکھرتا گیا مرا چہرہ

سحر کے نور سے ڈھلتی ہوئی تری آنکھیں
سفر کی گرد میں لپٹا ہوا مرا چہرہ

ہَوا کا آخری بوسہ تھا یا قیامت تھی؟
بدن کی شاخ سے پھر گِر پڑا مرا چہرہ

جسے بُجھا کے ہوا سوگوار پھرتی ہے
وہ شمعِ شامِ سفر تھی کہ تھا مرا چہرہ؟

یہ لوگ کیوں مجھے پہچانتے نہیں محسؔن
میں سوچتا ہوں کہاں رہ گیا مرا چہرہ

☆

اب کے یوں بھی تری زلفوں کی شکن ٹوٹی ہے
رنگ پھوٹے، کہیں خوشبو کی رَسَن ٹوٹی ہے

موت آئی ہے کہ تسکین کی ساعت آئی
سانس ٹوٹی ہے کہ صدیوں کی تھکن ٹوٹی ہے

سینۂ گُل جہاں نکہت بھی گراں ٹھہری تھی
تیر بن کر وہاں سُورج کی کرن ٹوٹی ہے

دل شکستہ تو کئی بار ہوئے تھے لیکن
اب کے یوں ہے کہ ہر اِک شاخِ بدن ٹوٹی ہے

اِتنی بے ربط محبت بھی کہاں تھی اپنی
درمیاں سے کہیں زنجیرِ سخن ٹوٹی ہے

ایک شعلہ کہ تہہِ خیمۂ جاں لپکا تھا
ایک بجلی کہ سرِ صحنِ چمن ٹوٹی ہے

سلسلہ تجھ سے بچھڑنے پہ کہاں ختم ہُوا
اِک زمانے سے رہ و رسمِ کہن ٹوٹی ہے

مرے یاروں کے تبسُّم کی کرن مقتل ہیں
نوکِ نیزہ کی طرح زیرِ کفن ٹوٹی ہے

ریزہ ریزہ میں بکھرتا گیا ہر سُو محسؔن
شیشہ شیشہ مری سنگینیٔ فن ٹوٹی ہے

☆

کب تلک شب کے اندھیرے میں سحر کو ترسے

وہ مسافر جو بھرے شہر میں گھر کو ترسے

آنکھ ٹھہرے ہوئے پانی سے بھی کتراتی ہے
دل وہ رہرو کہ سمندر کے سفر کو ترسے

مجھ کو اُس قحط کے موسم سے بچا ربِّ سخن
جب کوئی اہلِ ہُنر عرضِ ہُنر کو ترسے

اب کے اِس طور مسلّط ہو اندھیرا ہر سُو
ہجر کی رات مرے دیدۂ تر کو ترسے

عمر اتنی تو عطا کر مرے فن کو خالق؛
میرا دشمن میرے مرنے کی خبر کو ترسے

اُس کو پا کر بھی اُسے ڈھونڈ رہی ہیں آنکھیں
جیسے پانی میں کوئی سیپ گہر کو ترسے

ناشناسائی کے موسم کا اثر تو دیکھو!
آئینہ خال و خدِ آئینہ گر کو ترسے!

ایک دنیا ہے کہ بستی ہے تری آنکھوں میں
وہ تو ہم تھے جو تری ایک نظر کو ترسے

شورِ صر صر میں جو سَر سبز رہی ہے محسنؔ
موسمِ گل میں وہی شاخ ثمر کو ترسے

☆

پتھر ہی سہی، راہ میں حائل تو رہوں گا
کچھ دیر ترا مدِ مقابل تو رہوں گا

جب تک تیری بخشش کا بھرم کُھل نہیں جاتا
اے میری سخی، میں تیرا سائل تو رہوں گا

اِس واسطے زندہ ہوں سرِ مقتلِ یاراں
وابستۂ کم ظرفیِ قاتل تو رہوں گا

اے تیز ہَوا میرا دھواں دیکھ کے جانا
بجھ کر بھی نشانِ رہِ منزل تو رہوں گا

دشمن ہی سہی نام تو لے گا مرا تُو بھی
یوں میں تری آواز میں شامل تو رہوں گا

جب تک میں بغاوت نہ کروں جبر و ستم سے
زنداں میں ہوں پابندِ سَلاسِل تو رہوں گا

محسنؔ زدِ اعداً سے اگر مَر بھی گیا میں
معیارِ تمیزِ حق و باطل تو رہوں گا

☆

ترے بدن سے جو چھو کر اِدھر بھی آتا ہے
مثالِ رنگ وہ جھونکا' نظر بھی آتا ہے

تمام شب جہاں جلتا ہے اِک اُداس دیا
ہَوا کی راہ میں اِک ایسا گھر بھی آتا ہے

وہ مجھ کو ٹوٹ کے چاہے گا' چھوڑ جائے گا
مجھے خبر تھی اُسے یہ ہنر بھی آتا ہے

اُجاڑ بن میں اُترتا ہے ایک جگنو بھی
ہَوا کے ساتھ کوئی ہمسفر بھی آتا ہے

وفا کی کون سی منزل پہ اُس نے چھوڑا تھا
کہ وہ تو یاد ہمیں بھول کر بھی آتا ہے

جہاں لہُو کے سمندر کی حد ٹھہرتی ہے
وہیں جزیرۂ لعل و گُہر بھی آتا ہے

چلے جو ذکر فرشتوں کی پارسائی کا
تو زیرِ بحث مقامِ بشر بھی آتا ہے

ابھی سِناں کو سنبھالے رہیں عدو میرے
کہ ان صفوں میں کہیں میرا سر بھی آتا ہے

کبھی کبھی مجھے ملنے بلندیوں سے کوئی
شعاعِ صبح کی صورت اُتر بھی آتا ہے

اِسی لیے میں کسی شب نہ سو سکا محسنؔ
وہ ماہتاب کبھی بام پر بھی آتا ہے

☆

وفا میں اب یہ ہُنر اختیار کرنا ہے
وہ سچ کہے نہ کہے اعتبار کرنا ہے

یہ تجھ کو جاگتے رہنے کا شوق کب سے ہُوا؟
مجھے تو خیر ترا انتظار کرنا ہے

ہَوا کی زد میں جلانے ہیں آنسوؤں کے چراغ
کبھی یہ جشن سرِ رہگزار کرنا ہے

وہ مسکرا کے نئے وسوسوں میں ڈال گیا
خیال تھا کہ اُسے شرمسار کرنا ہے

مثالِ شاخِ برہنہ خزاں کی رُت میں کبھی

خود اپنے جسم کو بے برگ و بار کرنا ہے

ترے فراق میں دن کس طرح کٹیں اپنے
کہ شغلِ شب تو ستارے شمار کرنا ہے

چلو یہ اشک ہی موتی سمجھ کے بیچ آئیں
کسی طرح تو ہمیں روزگار کرنا ہے

کبھی تو دل میں چھپے زخم بھی نمایاں ہوں!
قبا سمجھ کے بدن تار تار کرنا ہے

خدا خبر یہ کوئی ضد کہ شوق ہے محسنؔ
خود اپنی جان کے دُشمن سے پیار کرنا ہے

☆

یہ کہہ گئے ہیں مسافر لٹے گھروں والے
ڈریں ہَوا سے پرندے کُھلے پروں والے

یہ میرے دل کی ہوس دشتِ بیکراں جیسی
وہ تیری آنکھ کے تیور سمندروں والے

ہَوا کے ہاتھ میں کاسے ہیں زرد پتّوں کے
کہاں گئے وہ سخی سبز چادروں والے؟

کہاں ملیں گے وہ اگلے دنوں کے شہزادے؟
پہن کے تن پہ لبادے گداگروں والے

پہاڑیوں میں گھرے یہ بُجھے بُجھے رستے
کبھی ادھر سے گزرتے تھے لشکروں والے

اُنہی پہ ہو کبھی نازِل عذاب' آگ' اجل
وہی نگر کبھی ٹھہریں پیمبروں والے

ترے سپرد کروں آئینے مقدّر کے
اِدھر تو آ مرے خوش رنگ پتّھروں والے

کسی کو دیکھ کے چُپ چُپ سے کیوں ہوئے محسنؔ
کہاں گئے وہ اِرادے سخنوروں والے؟

شہر بدر

کون اَب لگتا نہیں
میری طرح شہر بدر؟
اب تو
جس جس کو بھی دیکھو'صفِ آشفتہ سراں!

کوُبکُو

دیدۂ حیراں کا اثاثہ لے کر

چاک پیراہنِ جاں

خاکِ رہِ ہمسفراں

زخمِ اندوہ رخِ چارہ گراں

دامنِ دل میں لیے

صورتِ راہ گزر

شہر بدر، شہر بدر

چاندنی، ابر، ہوا

موسمِ گُل، موجِ صبا

سیپیاں چنتے ہوئے آئینہ گر

شہر بدر!!

رہگزاروں میں بھٹکتی ہوئی خوشبو

کہ حِنا

کُہر کی دودھیا چادر

کہ خلاؔ

دھول اوڑھے ہوے سانسوں کی گھٹا

پھول کی خواہشِ صد رنگ

ستاروں کی رِدا

آسماں

آبلہ پا شمس وقمر

شام وسحر

برگِ بے آب و ہوا

نالۂ نَے، دامنِ تر

شاخِ بے برگ و ثمر

شہر بدر، شہر بدر

قافلے، دشت، بھنور، دھوپ

بگولوں کا سفر

آگ کا رقص

دھواں، راکھ، شرر

۔۔۔شہر بدر

تیری پلکوں پہ لرزتے ہوئے

اشکوں کے گہر

تیرے چہرے پہ دہکتے ہوئے

جذبوں کی دھنک

تیری آنکھوں میں بکھرتے ہوئے

پیماں کی تھکن

تیرے ماتھے پہ

یہ ڈھلتے ہوئے تاروں کا غبار

(جس طرح بجھتے چراغوں کی ادھوری سی قطار)

تیری محفل کی اُداسی

تیری افسردہ نظر

شمعِ کشتہ کی خلش

ماتمِ خاشاکِ جگر

وصل کا عہد

جدائی کی خبر
دیدۂ تر
حسرتیں شعلہ بجاں
خواہشیں خاک بسر

از نگر تا بہ نگر
کوئی سوچے بھی مگر
کون اب لگتا نہیں
میری طرح شہر بدر
شہر بدر، شہر بدر

آج تنہائی نے تھوڑا سا دلاسہ جو دیا

آج تنہائی نے تھوڑا سا دلاسہ جو دیا
کتنے رُوٹھے ہوئے ساتھی مجھے یاد آئے ہیں

موسمِ وصل کی کرنوں کا وہ انبوہ رواں
جس کے ہمراہ کسی زُہرہ جبیں کی ڈولی
ایسے اُتری تھی کہ جیسے کوئی آیت اُترے

ہجر کی شام کے بکھرے ہوئے کاجل کی لکیر
جس نے آنکھوں کے گلابوں پہ شفق چھڑکی تھی
جیسے خوشبو کسی جنگل میں برہنہ ٹھہرے!!

خلقتِ شہر کی جانب سے ملامت کا عذاب
جس نے اکثر مجھے "ہونے" کا یقیں بخشا تھا

دستِ اعداٗ میں وہ کھنچتی ہوئی تہمت کی کماں
بارشِ سنگ میں کُھلتی ہوئی تیروں کی دُکاں
مہرباں دوست ' رفاقت کا بھرم رکھتے ہوئے
اجنبی لوگ دل و جاں میں قدم رکھتے ہوئے

آج تنہائی نے تھوڑا سا دلاسہ جو دیا!
کتنے رُوٹھے ہوئے ساتھی مجھے یاد آئے ہیں
اب نہ پندارِ وفا ہے نہ محبت کی جزا
دستِ اعداٗ کی کشش ہے نہ رفیقوں کی سزا
تختۂ دار نہ منصب ' نہ عدالت کی خلشِ
اب تو اک چیخ سی ہونٹوں میں دبی رہتی ہے

راس آئے گا کسے دشتِ بلا میرے بعد؟
کون مانگے گا اُجڑنے کی دعا میرے بعد؟

آج تنہائی نے تھوڑا سا دلاسہ جو دیا

بادل برسیں

بادل برسیں!
بادل اتنے زور سے برسیں!!
میرے شہر کی بنجر دھرتی
گم صُم خاک اُڑاتے رستے
سوکھے چہرے
پیلی آنکھیں
بوسیدہ مٹیالے پیکر ایسے بھیگیں
اپنے کو پہچان نہ پائیں!

بجلی چمکے!
بجلی اتنے زور سے چمکے!
میرے شہر کی سُونی گلیاں
مُدّت کے تاریک جھروکے
پُراسرار کھنڈر، ویرانے
ماضی کی مدھم تصویریں، ایسے چمکیں
سینے کا ہر بھید اُگل دیں

دل بھی دھڑکے!
دل بھی اتنے زور سے دھڑکے!!
سوچوں کی مضبوط طنابیں
خواہش کی اَن دیکھی گرہیں
رشتوں کی بوجھل زنجیریں... ایک چھناکے سے کھل جائیں
سارے رشتے
سارے بندھن

چاہوں بھی تو یاد نہ آئیں
آنکھیں۔۔۔اپنی دید کو ترسیں!
بادل اتنے زور سے برسیں!!

☆

اب یہ سوچوں تو بھنور ذہن میں پڑ جاتے ہیں
کیسے چہرے ہیں جو ملتے ہی بچھڑ جاتے ہیں

کیوں ترے درد کو دیں تہمتِ ویرانئ دل؟
زلزلوں میں تو بھرے شہر اُجڑ جاتے ہیں

موسمِ زرد میں اک دل کو بچاؤں کیسے؟
ایسی رُت میں تو گھنے پیڑ بھی جھڑ جاتے ہیں

اب کوئی کیا مرے قدموں کے نشاں ڈھونڈے گا
تیز آندھی میں تو خیمے بھی اُکھڑ جاتے ہیں

شغلِ اربابِ ہُنر پوچھتے کیا ہو کہ یہ لوگ
پتھّروں میں بھی کبھی آئینے جڑ جاتے ہیں

سوچ کا آئینہ دُھندلا ہو تو پھر وقت کے ساتھ
چاند چہروں کے خدوخال بگڑ جاتے ہیں

شدّتِ غم میں بھی زندہ ہوں تو حیرت کیسی؟
کچھ دِیے تُند ہواؤں سے بھی لڑ جاتے ہیں

وہ بھی کیا لوگ ہیں محسّن جو وفا کی خاطر!
خود تراشیدہ اُصولوں پہ بھی اَڑ جاتے ہیں

☆

فضا کا حبس شگوفوں کو باس کیا دے گا؟
بدن دریدہ کسی کو لباس کیا دے گا؟

یہ دل کی قحطِ اَنا سے غریب ٹھہرا ہے
مری زباں کو زرِ التماس کیا دے گا؟

جو دے سکا نہ پہاڑوں کو برف کی چادر
وہ میری بانجھ زمیں کو کپاس کیا دے گا؟

یہ شہر' یوُں بھی تو دہشت بھرا نگر ہے' یہاں
دلوں کا شور ہَوا کو ہراس کیا دے گا؟

وہ زخم دے کے مجھے حوصلہ بھی دیتا ہے
اب اس سے بڑھ کے طبیعت شناس کیا دے گا؟

جو اپنی ذات سے باہر نہ آ سکا اب تک
وہ پتھروں کو متاعِ حواس کیا دے گا؟

وہ میرے اشک بجھائے گا کس طرح محسنؔ
سمندروں کو وہ صحرا کی پیاس کیا دے گا؟

☆

دل ہُوا جب سے شرمسارِ شکست
بن گئے دوست پُرسہ دارِ شکست

ہر کوئی سرنگوں ہے لشکر میں
ہر کسی کو ہے انتظارِ شکست

کہہ رہی ہے تھکن دلیروں کی
اب کے چمکے گا کاروبارِ شکست

آئینے کی فضا تو اُجلی ہے
میرے چہرے پہ ہے غبارِ شکست

کامرانی کا گُر سکھا مجھ کو!

یا عطا کر مجھے وقارِ شکست

موت فتح و ظفر کی منزل ہے
زندگانی ہے رہگزارِ شکست

اس کے چہرے پہ فتح رقصاں تھی
اُس کے شانے تھے زیر بارِ شکست

کیسے قاتل کی شکل پہچانیں
اپنی آنکھوں میں ہے خمارِ شکست

جب تلک سر سناں پہ ہے اپنا
کون کرتا ہے اعتبارِ شکست؟

ہیں فضائیں دُھواں دُھواں محسنؔ
دیکھ رنگِ رخ بہارِ شکست

☆

سِکھا مجھ کو لٹے لوگوں کا ماتم
جلے جسموں بجھی آنکھوں کا ماتم

رہینِ دردِ جاں پیاروں کی ہجرت
نصیبِ دشمناں یاروں کا ماتم

جو فرصت ہو تو مرگِ روشنی پر
کبھی دیکھو مری پلکوں کا ماتم

وہ زیرِ آب لاشوں کی قطاریں
وہ سطحِ آب پر لہروں کا ماتم

خزاں پتّے پہن کر سو گئی ہے
ہَوا کرتی پھرے شاخوں کا ماتم

جو خاموشی کہ تہہ میں رہ گئے ہیں
مری آواز ' اُن لفظوں کا ماتم

جو سیلابوں کی رَو میں بہہ گئی ہیں
کرے گا کون اُن قبروں کا ماتم؟

مری غزلیں مری نظمیں ہیں محسنؔ
لہو لتھڑے ' چمن چہروں کا ماتم

☆

ظلم سہہ کر بھی سمجھتا ہوں کہ تُو میرا ہے
میرے دُشمن تیرے چہرے پہ لہُو میرا ہے

صُبحدم شہر کی شورِش تیرے دم سے ہوگی
رات کے پچھلے پہر عالمِ ہُو میرا ہے

میرے ہاتھوں میں چھپے زخم سے پہچان مجھے
تیرے دامن پہ بھی احسانِ رفو میرا ہے

گھر گیا ہوں میں تلاطم میں بھی زنداں کی طرح
حلقۂ موجِ رواں طوقِ گلُو میرا ہے

اِتنی شہرت بھی کہاں چاہی تھی خود سے میں نے
اپنے ہی شہر کا ہر شخص عدو میرا ہے

دھوپ چھاؤں کی یہ رُت دل میں ٹھہر جانے دے
عکس تیرا ہے تو سایا لبِ جُو میرا ہے

پتّھروں سے ہے محبت مجھے یوں بھی محسنؔ
سنگدل شہر مین اِک آئینہ رُو میرا ہے

☆

غزلوں کی دَھنک اوڑھ مرے شعلہ بدن تو
ہے میرا سخن تو ۔۔ مرا موضوعِ سخن تو

کلیوں کی طرح پھوٹ سرِ شاخِ تمنّا
خوشبو کی طرح پھیل چمن تا بہ چمن تو

نازل ہو کبھی ذہن پہ آیات کی صورت
آیات میں ڈھل جا کبھی جبریل دہن تو

اب کیوں نہ سجاؤں میں تجھے دیدہ و دل میں
لگتا ہے اندھیرے میں سویرے کی کرن تو

پہلے نہ کوئی رمزِ سخن تھی نہ کِنایہ
اب نقطۂ تکمیلِ ہُنر ، محورِ فن تو

یہ کم تو نہیں تو مرا معیارِ نظر ہے
اے دوست میرے واسطے کچھ اور نہ بن تو

ممکن ہو تو رہنے دے مجھے ظلمتِ جاں میں
ڈھونڈے گا کہاں چاندنی راتوں کا کفن تو

خدشہ

یہ تیری جھیل سی آنکھوں میں رتجگوں کے بھنور
یہ تیرے پھول سے چہرے پہ چاندنی کی پھوار
یہ تیرے لب یہ دیارِ یمن کی سُرخ عقیق
یہ آئینے سی جبیں، سجدہ گاہِ لیل و نہار

یہ بے نیاز گھنے جنگلوں سے بال ترے
یہ پھولتی ہوئی سرسوں کا عکس گالوں پر
یہ دھڑکنوں کی زباں بولتے ہوئے ابرُو
کمند ڈال رہے ہیں مرے خیالوں پر

یہ نرم نرم سے ہاتھوں کا گرم گرم سا لمس
گداز جسم پہ بلّور کی تہوں کا سَماں!
یہ اُنگلیاں، یہ زمُرّد تراشتی شاخیں!
کِرن کِرن ترے دانتوں پہ موتیوں کا گماں

یہ چاندنی میں دُھلے پاؤں جب بھی رقص کریں
فضا میں اَن گنےِ گھنگھرو چھنکنے لگتے ہیں
یہ پاؤں جب کسی رستے میں رنگ برسائیں
تو موسموں کے مقدّر چمکنے لگتے ہیں !!

تری جبیں پہ اگر حادثوں کے نقش اُبھریں
مزاجِ گردشِ دوراں بھی لڑکھڑا جائے

تو مسکرائے تو صحبیں تجھے سلام کریں
تو رو پڑے تو زمانے کی آنکھ بھر آئے

ترا خیال ہے خوشبوٗ ترا لباس کِرن!
توٗ خاک زاد ہے یا آسماں سے اُتری ہے؟
میں تجھ کو دیکھ کے خود سے سوال کرتا ہوں
یہ موجِ رنگ زمیں پر کہاں سے اُتری ہے؟

میں کس طرح تجھے لفظوں کا پیرہن بخشوں؟
مرے ہنر کی بلندی تو سرنگوں ہے ابھی!
ترے بدن کے خدوخال میرے بس میں نہیں
میں کس طرح تجھے سوچوں ' یہی جنوں ہے ابھی

ملے ہیں یوں تو کئی رنگ کے حسیں چہرے!
میں بے نیاز رہا موجۂ صبا کی طرح!!
تری قسم تری قربت کے موسموں کے بغیر'
زمیں پہ میں بھی اکیلا پھرا خدا کی طرح

مگر میں شہرِ حوادث کے سنگ زادوں سے
یہ آئینے سا بدن کس طرح بچاؤں گا؟
مجھے یہ ڈر ہے کِسی روز تیرے کرب سمیت
میں خود بھی دُکھ کے سمندر میں ڈوب جاؤں گا!

مجھے یہ ڈر ہے کہ تیرے تبسّموں کی پھوار
یونہی وفا کا تقاضا' حیا کا طور نہ ہو؟

ترا بدن، تری دنیا ہے منتظر جس کی
میں سوچتا ہوں مری جاں وہ کوئی "اور" نہ ہو

میں سوچتا ہوں مگر سوچنے سے کیا حاصل؟
یہ تیری جھیل سی آنکھوں میں رتجگوں کے بھنور

☆

خلوت میں کُھلا ہم پہ کہ بیباک تھی وہ بھی
محتاط تھے ہم لوگ بھی، چالاک تھی وہ بھی

افکار میں ہم لوگ بھی ٹھہرے تھے قد آور!
پندار میں "ہم قامتِ افلاک" تھی وہ بھی

اسے پاسِ ادب، سنگ صفت عزم تھا اس کا
اسے سیلِ طلب، صورتِ خاشاک تھی وہ بھی

جس شب کا گریباں ترے ہاتھوں سے ہوُا چاک
اے صبح کے سوُرج، مری پوشاک تھی وہ بھی

اِک شوخ کرن چوُمنے اُتری تھی گلوں کو
کچھ دیر میں پیوستِ رگِ خاک تھی وہ بھی

جس آنکھ کی جنبش پہ ہوئیں نصب صلیبیں
مقتل میں ہمیں دیکھ کے نمناک تھی وہ بھی

دیکھا جو اُسے، کوئی کشش ہی نہ تھی اُس میں
سوچا جو اُسے، حاصلِ ادراک تھی وہ بھی

جو حرف مرے لب پہ رہا زہر تھا محسنؔ
جو سانس مرے تن میں تھی سفّاک تھی وہ بھی

☆

کل رات بزم میں جو مِلا گلبدن سا تھا
خوشبو سے اُس کے لفظ تھے چہرہ چمن سا تھا

دیکھا اُسے تو بول پڑے اس کے خدوخال
پُوچھا اُسے تو چُپ سا رہا، کم سخن سا تھا

تنہائیوں کی رُت میں بھی لگتا تھا مطمئن!
وہ شخص اپنی ذات میں اِک انجمن سا تھا

سوچا اُسے تو میں کئی رنگوں میں کھو گیا
عالم تمام اُس کے حَسیں پیرہن سا تھا

جو شاخ شوخ تھی وہ اُسی کے لبوں سی تھی
جو پھُول کِھل گیا وہ اُسی کے دہن سا تھا

وہ سادگی پہن کے بھی دل میں اُتر گیا
اس کی ہر اک ادا میں عجب بھولپن سا تھا

آسماں سمجھ رہے تھے اُسے شہرِ جاں کے لوگ
مشکل تھا اِس قدر کہ میرے اپنے فن سا تھا

وہ گفتگو تھی اُس کی، اُسی کے لیے ہی تھی!
کہنے کو یوُں تو میں بھی شریکِ سخن سا تھا

تارے تھے چاندنی میں کہ تہمت کے داغ تھے
محسنؔ کل آسمان بھی میرے کفن سا تھا

☆

مانگے ہے مجھ سے دل تری ساری نشانیاں
باتیں پرانیاں، وہی راتیں سُہانیاں

آنکھوں میں گھولتی ہیں نشے کی شرارتیں
چالاک چاندنی میں چھکتی جوانیاں

اُن پر تو قرض ہیں مرے حرفوں کے ذائقے
اب جن کو آ گئیں بڑی باتیں بنانیاں

اے عشق آ کہ پھر سے کوئی تجربہ کریں
میں بھولنے لگا ہوں پرانی کہانیاں

وہ تیرے قہقہے تھے کہ جیسے ہجوم میں
ٹوٹیں کلائیوں میں کھنکتی کمانیاں

یہ میرے اشک ہیں کہ پہاڑوں میں جس طرح
روئیں بسنت رُت میں ندی کی روانیاں

اِک تیرے روٹھنے سے فضا ہی بدل گئی
اب شہر بھر میں پھَیل گئیں بدگمانیاں

مانگو دعا کہ کھیلتی کِھلتی رہیں سدا
شہروں کی دُلہنیں، مری بستی کی رانیاں

محسنؔ کو کچھ تو حدِّ ستم کا سُراغ دے
کب تک رقم کروں میں تری مہربانیاں؟

☆

جب بھی ہنسنے کے زمانے آئے
زخم پھر یاد پُرانے آئے

بارہا اُن کو منایا تو ہمیں
رُوٹھ جانے کے بہانے آئے

پھر مجھے ٹوٹ کے چاہا اُس نے
پھر بچھڑنے کے زمانے آئے

مسکرا کر ہمیں ملنے والے
زندگی بھر کو رُلانے آئے

کتنی محروم تھیں نیندیں اُن کی
خواب بھی جن کو جگانے آئے

تیری چاہت نے ٹھہرنے نہ دیا
راہ میں کتنے ٹھکانے آئے

تُو نہیں ہے تو ہَوا کا جھونکا
گھر کی زنجیر ہلانے آئے

دل بُجھا ہے نہ جلے ہیں خیمے
آپ کیوں جشن منانے آئے؟

اِسی اُمیّد پہ جاگو یارو!
اب وہ کس وقت نجانے آئے؟

راس آیا جنھیں صحرا محسنؔ
اُن کی قسمت میں خزانے آئے

☆

شامِ غم جب بکھر گئی ہو گی
جانے کس کس کے گھر گئی ہو گی؟

اِتنی لرزاں نہ تھی چراغ کی لَو
اپنے سائے سے ڈر گئی ہو گی

چاندنی ایک شب کی مہماں تھی
صبح ہوتے ہی مَر گئی ہو گی

دیر تک وہ خفا رہے مجھ سے
دُور تک یہ خبر گئی ہو گی

ایک دریا کے رُخ بدلتے ہی
اِک ندی پھر اُتر گئی ہو گی

جس طرف وہ سفر پہ نکلا تھا
ساری رونق اُدھر گئی ہو گی

رات سورج کو ڈھونڈنے کے لیے
تابہ حدِّ سحر گئی ہو گی

میری یادوں کی دھوپ چھاؤں میں
اُس کی صورت نکھر گئی ہو گی

یا تعلّق نہ نبھ سکا اس سے
یا طبیعت ہی بھر گئی ہو گی

تیری پل بھر کی دوستی محسنؔ
اُس کو بدنام کر گئی ہو گی!

اپنے دُکھتے دل سے کہہ دو!

رات کے دو بجنے کو آئے
پھیل چلے سنّاٹے، سائے

زخموں کی ہریالی چُپ ہے
درد کے پیڑ آسیب زدہ ہیں
سوچ کی ڈالی ڈالی چُپ ہے

اپنے دُکھتے دل سے کہہ دو!
نیند کے جنگل میں کھو جائے
کافی جاگ لیا ۔۔ سو جائے

دُور ۔ "پہاڑی" کے سُر جاگے
مَست ہَوا نے لی انگڑائی!
رات نے اپنی لَٹ چھٹکائی

کون یہ روگی۔ جوگی ہوگا؟
جس کی جوگ بھری استھائی
"بھیرو" کی پازیب سے اُلجھی
سانس کے سَرگم سے ٹکرائی

کس کے ہونٹوں کی خوشبو نے
بانسریا کی لَے مہکائی؟

اپنے دُکھتے دل سے کہہ دو!
سب کے پردیسی اک جیسے
سب کا "سانوریا" ہرجائی

اُداس رُت' اِنتظار موسم

اُداس رُت
انتظار موسم
ہَوا کی یخ بستہ آہٹوں سے پَرے
خموشی کی زرد چادر بدن پہ اوڑھے
خزاں رسیدہ شجر کی ٹہنی پہ جھولتا چاند کہہ رہا ہے
کہ سو بھی جاؤ!
کہ سو بھی جاؤ اُداس لوگو!
وہ انجمن جس کی جھلملاتی تمام شمعیں
تمام راتیں
تمام باتیں
کبھی تمھاری محبتوں سے بھرے زمانوں کی ترجماں تھیں
کبھی تمھارے تمام لمحوں پہ مہرباں تھیں
وہ انجمن اب تمھاری سوچوں سے دُور
خوابوں کی دستکوں سے پرے سجے گی
وہاں پہ نوبت نئی بجے گی!!!
کبھی تمھارے بدن کی خوشبو سے کھیلتی تھی جو رات رانی
وہ ہجر کے اَدھ کھلے دریچے میں ہانپتے جس کی ہتھیلی پہ
آخری سانس لے رہی ہے
اُداس لوگو!
اُجاڑ آنکھوں کے آئینے توڑ دو کہ ان میں
نہ کوئی عکسِ نگارِ ہستی

نہ کوئی بستی بسا سکو گے

بس اک متاعِ حیات باقی ہے، اب جسے تم

گنوا سکو گے!

تو اِس سے پہلے کہ سانس کی ڈور ٹوٹ جائے!

ہَوا ہتھیلی سے

خوشبوؤں کا ہر ایک رشتہ ہی ٹوٹ جائے!

کِرن کواڑوں کو بند کر کے

اُجاڑ خوابوں کی رہگزر کا غبار آنکھوں میں بھر کے

ہر سُو ہَوا کے ہاتھوں بکھر بکھر کے

خود اپنے اندر کے دُکھ کی مٹی میں کھو بھی جاؤ!

ہَوا یہ کہتی ہے، سو بھی جاؤ!

اُداس رُت !

اِنتظار موسم!!

کبھی کسی کے نہ ہو سکیں گے!!!

بھول جاؤ مجھے.......!

وہ تو یوں تھا کہ ہم

اپنی اپنی ضرورت کی خاطر ملے!

اپنے اپنے تقاضوں کو پورا کیا

اپنے اپنے ارادوں کی تکمیل میں

تیرہ و تار خواہش کی سنگلاخ راہوں پہ چلتے رہے
پھر بھی راہوں میں کتنے شگوفے کھِلے
وہ تو یوں تھا کہ بڑھتے گئے سلسلے!!

ورنہ یوں ہے کہ ہم
اجنبی کل بھی تھے
اجنبی اب بھی ہیں
اب بھی یوں ہے کہ تُم
ہر قسم توڑ دو
سب ضدیں چھوڑ دو!

اور اگر یوں نہ تھا تو یونہی سوچ لو
تم نے اِقرار ہی کب کیا تھا کہ میں
تم سے منسُوب ہوں
میں نے اصرار ہی کب کیا تھا کہ تم
یاد آؤ مجھے!
بھول جاؤ مجھے!!

☆

متاعِ شامِ سفر بستیوں میں چھوڑ آئے
بجھے چراغ ہم اپنے گھروں میں چھوڑ آئے

بچھڑ کے تجھ سے چلے ہم تو اب کے یوں بھی ہُوا
کہ تیری یاد کہیں راستوں میں چھوڑ آئے

ہم اپنی دَر بدری کے مشاہدے اکثر
نصیحتوں کی طرح کم سِنوں میں چھوڑ آئے

خراجِ سیلِ بلا اس سے بڑھ کے کیا ہو کہ لوگ
کھُلے مکان بھری بارشوں میں چھوڑ آئے

گھرے ہیں لشکرِ اعدا میں اور سوچتے ہیں
ہم اپنے تیر تو اپنی صفوں میں چھوڑ آئے

ہوا ہی دن میں پرندے اُڑائے پھرتی ہے
ہوا ہی پھر سے اُنہیں گھونسلوں میں چھوڑ آئے

کسے خبر ہے کہ زخمی غزال کس کے لیے؟
نِشاں لہُو کے گھنے جنگلوں میں چھوڑ آئے

ہمارے بعد بھی رونق رہے گی مقتل میں
ہم اہلِ دل کو بڑے حوصلوں میں چھوڑ آئے

اُڑیں گے کیا وہ پرندے جو اپنے رزق سمیت
سفر کا شوق بھی ٹوٹے پَروں میں چھوڑ آئے

سدا سُکھی رہیں چہرے وہ ہم جنھیں محسنؔ

بجھے گھروں کی کھلی کھڑکیوں میں چھوڑ آئے

☆

اڑان کی کوئی صورت نظر میں خاک نہیں
بجز نشانِ قفس بال و پر میں خاک نہیں

ہَوا متاعِ سفر پوچھنے کو آئی ہے
کہو کہ دامنِ اہلِ سفر میں خاک نہیں

یہ اِک چراغ، ہَوا سے رکھو بچا کے اِسے
یہ بُجھ گیا تو سمجھنا کہ گھر میں خاک نہیں

غبارِ ہمسفراں، آنکھ سے نہ اوجھل ہو
ترے سوا تو مری رہگزر میں خاک نہیں

کِسی کے سائیہ زلف و شعاعِ لب کے سوِا
دیارِ شام و حصارِ سحر میں خاک نہیں

بہت دنوں سے کمالِ ہُنر ہے خاک بہ سر
بہت دنوں سے کفِ کوزہ گر میں خاک نہیں

اُدھر وہ شور کہ سیلِ فنا ہے زوروں پر
اِدھر یہ حال کہ دیوار و در میں خاک نہیں

بس ایک ہم سے ہے قائم وقارِ فصلِ جنوں
وگرنہ ربط یہاں سنگ و سر میں خاک نہیں

کشش ہو کیا مرے فن میں کہ ان دنوں محسنؔ
خلش تو خواہشِ خونِ جگر میں خاک نہیں

☆

دریا مچل رہا ہے اگر انتقام کو
میں بھی لکھوں گا ریت پہ اب اپنے نام کو

کہتے ہیں اُس سے بچ کے گزرتی ہیں آندھیاں
جس قبر پر چراغ نہ جلتا ہو شام کو

ساحل بھگو رہی تھی سخاوت فُرات کی
گھیرا ہُوا تھا آگ نے میرے خیام کو

بیدارئ ضمیرِ کفِ خاک حشر ہے
سورج اُتر رہا ہے زمیں کے سلام کو

تنقید کر کے میرے ہُنر کی اُڑان پر
تسلیم کر رہا تھا وہ میرے مقام کو

جو تیری منتظر تھیں وہ آنکھیں ہی بجھ گئیں
اب کیوں سجا رہا ہے چراغوں سے بام کو

رُوٹھی ہوئی ہوائیں کہاں ہیں کہ دشت میں
محسنؔ ترس گئے ہیں بگولے خرام کو

☆

اب یہ معیارِ سفر لگتا ہے
کوئی صحرا بھی ہو گھر لگتا ہے

ہجر کی رات کے سنّاٹے میں
سانس لیتے ہوے ڈر لگتا ہے

شہر میں بے ہنری عام ہوئی
ہر کوئی اہلِ ہنر لگتا ہے

اپنی صورت سے ہے نفرت جس کو

وہ کوئی آئینہ گر لگتا ہے

نوکِ نیزہ پہ جو سج کر نکلا
کسی خوددار کا سَر لگتا ہے

جب بھی ٹوٹے یہ بکھرتا جائے
دل کسی کُونج کا پَر لگتا ہے

جو بھرے شہر سے شب کو نکلا
وہ کوئی اہلِ خبر لگتا ہے

جس نے اِس شہر کی بُنیاد رکھی
اب وہی شہر بدر لگتا ہے

اب کے دریا میں نہ اُترو محسنؔ
موج در موج بھنّور لگتا ہے

☆

ہجر کی صبح کے سورج کی اُداسی مت پُوچھ

جتنی کرنیں ہیں وہ اشکوں کی طرح پھوٹتی ہیں

تجھ سے پہلے بھی کئی زخم تھے سینے میں مگر!
اَب کے وہ درد ہے دل میں کہ رگیں ٹوٹتی ہیں

رات پھر اشک رہے دامنِ مژگاں سے اُدھر
کشتیاں شب کو کناروں سے کہاں چھوٹتی ہیں

گاؤں کے تنہا اندھیروں کی طرف لَوٹ چلو
شہر کی روشنیاں' دل کا سکوں لوٹتی ہیں

اُجاڑ بستی کے باسیو! ایک دوسرے سے پرے نہ رہنا
ہوا درختوں سے کہہ گئی ہے' کِسی بھی رُت میں ہرے نہ رہنا

میں اپنے رُوٹھے ہُوئے قبیلے کی سازشوں میں گِھرا ہُوا ہوں
تم اجنبی ہو تو میرے آنگن کی وحشتوں سے ڈرے نہ رہنا

پھٹے ہُوئے بادباں کے پُرزے بِکھر بِکھر کے یہ کہہ رہے تھے
شکستہ کشتی کے ناخداؤ' ہواؤں کے آسرے نہ رہنا

یقیں ہے اب کے وصال موسم کے بانجھ پن کی دلیل ہوگا

تمھاری آنکھوں کی سیپیوں کا یہ موتیوں سے بھرے نہ رہنا

سخنورو اس منافقت سے تو خودکشی کا شعار سیکھو
زبان کا زخم زخم ہونا، حروف کا کھردرے نہ رہنا

دلوں کی بستی کے لوگ محسنؔ اجڑ اجڑ کے یہ کہہ گئے ہیں
جہاں وفاؤں میں کھوٹ دیکھو، وہاں سخن میں کھرے نہ رہنا

مِری گلی کے غلیظ بچّو!

مِری گلی کے غلیظ بچّو!
تم اپنے میلے بدن کی ساری غلاظتوں کو اُدھار سمجھو!
تمھاری آنکھیں!
اُداسیوں سے بھری ہوئی ہیں
ازل سے جیسے ڈری ہوئی ہیں
تمھارے ہونٹوں پہ پپڑیوں کی جمی ہوی تہہ یہ کہہ رہی ہے
حیات کی آبجُو پسِ پشت بہہ رہی ہے
تمھاری جیبیں منافقت سے اَٹی ہوئی ہیں
سبھی قمیصیں پھٹی ہوئی ہیں
تمھاری پھیکی ہتھیلیوں کی بجھی لکیریں
بقا کی اَبجد سے اجنبی ہیں
تمھاری قسمت کی آسمانی نشانیاں اب ''خطوط وحدانیوں''
کا مقسوم ہو رہی ہیں

نظر سے معدوم ہو رہی ہیں

مِری گلی کے غلیظ بچّو!

تمھارے ماں باپ نے تمدّن کا قرض لے کر

تمھاری تہذیب بیچ دی ہے!

تمھارا استاد اپنی ٹوٹی ہوئی چھڑی لے کے چُپ کھڑا ہے!

کہ اُس کے سوکھے گلے میں نانِ جویں کا ٹکڑا اڑا ہُوا ہے

مِری گلی کے غلیظ بچّو!

تمھارے میلے بدن کی ساری غلاظتیں اب گئے زمانوں

کے ارمغاں ہیں

تمھارے ورثے کی داستاں ہیں

انھیں سنبھالو

کہ آنے والا ہر ایک لمحہ تمھارے جھڑتے ہوئے پپوٹوں سے

جانے والے دنوں کی

کُھرچن اُتار لے گا!

مِری گلی کے غلیظ بچّو!

ضدوں کو چھوڑو!

قریب آؤ!!

رُتوں کی نفرت کو پیار سمجھو!

خزاں کو رنگِ بہار سمجھو!!

غلاظتوں کو اُدھار سمجھو!!!

جانتے تو ہم بھی تھے!

جانتے
تو ہم بھی تھے
مانتے
تو ہم بھی ہیں
اتنی تیز آندھی میں
کب چراغ جلتا ہے؟

دل مگر مچلتا ہے
دل کی ضد کو کیا کہیے!
اب کے ہم نے
سوچا ہے!
کم نفس چراغوں میں
اِک چراغ ایسا بھی
جل کے ہم جلائیں گے
تُند خُو ہوائیں بھی
اُس کو جب
بجھائیں گی
دل بھی بجھ ہی جائے گا!

☆

اب کے بارش میں تو یہ کارِ زیاں ہونا ہی تھا
اپنی کچّی بستیوں کو بے نشاں ہونا ہی تھا

کِس کے بس میں تھا ہَوا کی وحشتوں کو روکنا
برگِ گُل کو خاک' شعلے کو دھواں ہونا ہی تھا

جب کوئی سمتِ سفر طے تھی نہ حدِّ رہگزر
اے مرے رہرَو سفر تو رائیگاں ہونا ہی تھا

مجھ کو رُکنا تھا' اُسے جانا تھا اگلے موڑ تک
فیصلہ یہ اُس کے میرے درمیاں ہونا ہی تھا

چاند کو چلنا تھا بہتی سیپیوں کے ساتھ ساتھ
معجزہ یہ بھی تہہِ آب رواں ہونا ہی تھا

میں نئے چہروں پہ کہتا تھا نئی غزلیں سدا
میری اس عادت سے اُس کو بدگماں ہونا ہی تھا

شہر سے باہر کی ویرانی بسانا تھی مجھے
اپنی تنہائی پہ کچھ تو مہرباں ہونا ہی تھا

اپنی آنکھیں دفن کرنا تھیں غبارِ خاک میں
یہ ستم بھی ہم پہ زیرِ آسماں ہونا ہی تھا

بے صدا بستی کی رسمیں تھیں یہی محسنؔ مرے
میں زباں رکھتا تھا' مجھ کو بے زباں ہونا ہی تھا

☆

کٹھن تنہائیوں سے کون کھیلا' میں اکیلا
بھرا اب بھی مرے گاؤں کا میلہ' میں اکیلا

بچھڑ کر تجھ سے میں شب بھر نہ سویا' کون رویا؟
بجز میرے یہ دُکھ بھی کس نے جھیلا' میں اکیلا

یہ بے آواز بنجر بن کے باسی' یہ اُداسی!
یہ دہشت کا سفر' جنگل یہ ''بیلہ'' مَیں اکیلا

میں دیکھوں کب تلک منظر سُہانے' سب پُرانے
وہی دُنیا وہی دل کا جھمیلا' میں اکیلا

وہ جس کے خوف سے صحرا سدھارے' لوگ سارے
گزرنے کو ہے طوفاں کا وہ ریلا' میں اکیلا

☆

مرے کفن کی سیاہی دلیل ہے اس کی
مرے سوا مِرا پُرسہ کسی نے بھی نہ دیا

شبوں کی راکھ میں یوں گم ہُوا وجود مرا
مرا سراغ مری روشنی نے بھی نہ دیا

میں درگزر کا سبق دشمنوں سے لیتا ہوں
یہ درس مجھ کو تری دوستی نے بھی نہ دیا

سوال بن کے مری گُمرہی بکھرتی رہی
مگر جواب تری آگہی نے بھی نہ دیا!

☆

وہ اجنبی اجنبی سے چہرے وہ خواب خیمے رواں دواں سے
بسے ہوُے ہیں ابھی نظر میں سبھی مناظر دھواں دھواں سے

یہ عکسِ داغِ شکستِ پیماں وہ رنگِ زخمِ خلوُصِ یاراں

میں غمگساروں میں سوچتا ہوں کہ بات چھیڑوں کہاں کہاں سے؟

یہ سنگریزے عداوتوں کے وہ آبگینے سخاوتوں کے
دلِ مسافر قبول کر لے' ملا ہے جو کچھ جہاں جہاں سے

بچھڑنے والے بچھڑ چلا تھا تو نسبتیں بھی گنوا کے جاتا
ترے لیے شہر بھر میں اب بھی مَیں زخم کھاؤں زباں زباں سے

مری محبت کے واہموں سے پرے تھا تیرا وجود ورنہ
جہاں جہاں تیرا عکس ٹھہرا میں ہو کے آیا وہاں وہاں سے

تو ہمنفس ہے نہ ہمسفر ہے کسے خبر ہے کہ تُو کدھر ہے؟
میں دستکیں دے کے پُوچھ بیٹھا مکیں مکیں سے مکاں مکاں سے

ابھی محبت کا اسمِ اعظم لبوں پہ رہنے دے جانِ محسنؔ!
ابھی ہے چاہت نئی نئی سی' ابھی ہیں جذبے جواں جواں سے

☆

باتیں تری الہام ہیں' جادُو تری آواز
رَگ رَگ میں اُترتی ہُوئی خوشبُو تری آواز

بہتے چلے جاتے ہیں تہہِ آب ستارے!
جیسے کہیں اُتری ہو لبِ جُو تری آواز

پابندِ شبِ کُنجِ قفس میں، مرا احساس
اُمید کی دھندلی سی کِرن تُو، تری آواز

میں شامِ غریباں کی اُداسی کا مسافر
صحراؤں میں جیسے کوئی جگنو تری آواز

لفظوں میں چھپائے ہُوئے بے ربط دلاسے
چُنتی رہی شب بھر مرے آنسو تری آواز

بس ایک مرے شوق کی تسکین کی خاطر
کیا کیا نہ بدلتی رہی پہلو تری آواز

یہ ہجر کی شب بھیگ چلی ہے کہ مرے بعد
روتی ہے کہیں کھول کے گیسو تری آواز؟

دیکھوں تو وہی میں وہی چپ چپ سے درو بام
سوچوں تو بکھر جائے ہر اِک سُو تری آواز

محسنؔ کے خیالوں میں اُترتی ہے سرِ شام
رِم جھم کی طرح باندھ کے گھنگھرو تری آواز

☆

چاہیے دنیا سے ہٹ کر سوچنا
دیکھنا صحرا، سمندر سوچنا

مار ڈالے گا ہمیں اس شہر میں
گھر کی تنہائی پہ اکثر سوچنا

دشمنی کرنا ہے اپنے آپ سے
آئینہ خانے میں پتھر سوچنا

چاندنی، مَیں، تُو، کنارِ آبجُو
بند آنکھوں سے یہ منظر سوچنا

چند تشبیہیں سجانے کے لیے
مُدّتوں اُس کے بدن پر سوچنا

ایک پَل ملنا کسی سے اور پھر
اہلِ فن کا زندگی بھر سوچنا

چاند ہے یا اس کے پیکر کے خطوط
جھیل کی تہہ میں اُتر کر سوچنا

رفعتِ دار و عروجِ بام کو
دوستو نوکِ سناں پر سوچنا

جاگتے رستوں میں کیا کچھ کھو گیا
اوڑھ کر خوابوں کی چادر سوچنا

خشک پتّوں کی طرح محسنؔ کبھی
تم بھی صحرا میں بکھر کر سوچنا

☆

ہجوم میں تھا وہ کُھل کر نہ رو سکا ہوگا
مگر یقیں ہے کہ شب بھر نہ سو سکا ہوگا

وہ شخص جس کو سمجھنے میں مجھ کو عمر لگی
بچھڑ کے مجھ سے کسی کا نہ ہو سکا ہوگا

لرزتے ہاتھ، شکستہ سی ڈور سانسوں کی
وہ خشک پھول کہاں تک پرو سکا ہوگا؟

بہت اُجاڑ تھے پاتال اُس کی آنکھوں کے
وہ آنسوؤں سے نہ دامن بھگو سکا ہوگا

مرے لیے وہ قبیلے کو چھوڑ کر آتا
مجھے یقیں ہے یہ اُس سے نہ ہو سکا ہوگا

☆

اب تو خواہش ہے کہ یہ زخم بھی کھا کر دیکھیں
لمحہ بھر کو ہی سہی اُس کو بھلا کر دیکھیں

شہر میں جشنِ شبِ قدر کی ساعت آئی
آج ہم بھی ترے ملنے کی دعا کو دیکھیں

آندھیوں سے جو اُلجھنے کی کسک رکھتے ہیں
اِک دیا تیز ہَوا میں بھی جلا کر دیکھیں

کچھ تو آوارہ ہواؤں کی تھکن ختم کریں
اپنے قدموں کے نشاں آپ مٹا کر دیکھیں

زندگی اب تجھے سوچیں بھی تو دم گھُٹتا ہے
ہم نے چاہا تھا' کبھی تجھ سے وفا کر دیکھیں

جن کے ذرّوں میں خزاں ہانپ کے سو جاتی ہے

ایسی قبروں پہ کوئی پھول سجا کر دیکھیں

دیکھنا ہو تو محبت کے عزاداروں کو
ناشناسائی کی دیوار گِرا کر دیکھیں

یوں بھی دنیا ہمیں مقروض کیے رکھتی ہے
دستِ قاتل ترا احساں بھی اُٹھا کر دیکھیں

رونے والوں کے تو ہمدرد بہت ہیں محسنؔ
ہنستے ہنستے کبھی دنیا کو رُلا کر دیکھیں

☆

کوئی نئی چوٹ پھر سے کھاؤ' اُداس لوگو!
کہا تھا کس نے کہ مسکراؤ' اُداس لوگو!

گزر رہی ہیں گلی سے پھر ماتمہ ہوئیں
کِواڑ کھولو' دیئے بجھاؤ' اُداس لوگو!

جو رات مقتل میں بال کھولے اُتر رہی تھی
وہ رات کیسی رہی' سناؤ اُداس لوگو!

کہاں تلک بام و دَر چراغاں کیے رکھو گئے؟
بچھڑنے والوں کو بھول جاؤ اُداس لوگو!

اُجاڑ جنگل، ڈری فضا، ہانپتی ہوائیں
یہیں کہیں بستیاں بساؤ اُداس لوگو!

یہ کس نے سہمی ہوئی فضا میں ہمیں پکارا؟
یہ کس نے آواز دی کہ آؤ اُداس لوگو!

یہ جاں گنوانے کی رُت یونہی رائیگاں نہ جائے!
سرِ سناں کوئی سر سجاؤ اُداس لوگو!

اُسی کی باتوں سے ہی طبیعت سنبھل سکے گی
کہیں سے محسنؔ کو ڈھونڈ لاؤ اُداس لوگو!

ایک نئے لفظ کی تخلیق

زندگی لفظ ہے
موت بھی لفظ ہے

زندگی کی تراشی ہوئی اوّلیں صَوت سے سرحدِ موت تک

لفظ ہی لفظ ہیں!!

''سانس'' بھی لفظ ہے

سانس لینے کی ہر اک ضرورت بھی لفظوں کی محتاج ہے

آگ' پانی' ہوا' خاک سب لفظ ہیں

آنکھ' چہرہ' جبیں' ہاتھ' لَب لفظ ہیں

صبح و شام و شفق' روز و شب لفظ ہیں

وقت بھی لفظ ہے

وقت کا ساز و آہنگ بھی

رنگ بھی سنگ بھی

امن بھی جنگ بھی

لفظ ہی لفظ ہیں

پھول بھی لفظ ہے

دُھول بھی لفظ ہے

لفظ قاتل بھی ہے

لفظ مقتول بھی

لفظ ہی ''خوں بہا''!

لفظ دستِ دعا!!

لفظ ارض و سَما!!!

صبح فصلِ بہاراں بھی اِک لفظ ہے

شامِ ہجر نگاراں بھی اِک لفظ ہے

رونقِ بزمِ یاراں بھی اِک لفظ ہے

محفلِ دلفگاراں بھی اِک لفظ ہے

'' مَیں '' بھی اک لفظ ہوں

''تُو'' بھی اک لفظ ہے!

آ کہ لفظوں کی صورت فضاؤں میں مل کر بکھر جائیں ہم
اِک نیا لفظ تخلیق کر جائیں ہم
آ کہ مر جائیں ہم

اے شبِ ہجرِ یاراں!

اے شبِ ہجرِ یاراں!
تری ہچکیاں کون سُنتا ہے؟
کوئی بھی سنتا نہیں!
جاگتی آنکھ میں خواب کی جھالریں
کون بُنتا ہے؟
کوئی بھی بُنتا نہیں!
مسکراتے ستاروں کے انبوہ میں رقص کرتی ہوئی
کہکشاں چھوڑ کر
قریۂ مہر و مہتاب کے آئنے توڑ کر
لعل و یاقوت و مرجاں بھری وادیوں سے دل و جاں کے
سب رابطے جوڑ کر
سنگریزوں کی صورت بکھرتے ہوئے
چند آنسو ترے
کون چُنتا ہے؟
کوئی بھی چُنتا نہیں؟

اے شب ہجرِ یاراں، مرے پاس آ

میرے پہلو میں سو جا کہ میں بھی تو اپنے بھرے شہر میں

ہوں اکیلا بہت

میرے پہلو میں سو جا کہ شاید مرے دُکھ کی آغوش میں

تجھ کو سُکھ سانس لینے کی فرصت مِلے

تجھ کو لوری سُنائے اُداسی مری

(مدّتوں سے ہے آغوش پیاسی مری)

اے شب ہجرِ یاراں

مری ہمسفر!

میں تیرا نوحہ خواں!

میرا آوارہ دل مدّتوں سے ترے درد کا چارہ گر!

تُو مری مہرباں!

میں ترا رازداں

میری جاں، یوں تو کہنے کو چارہ گرِ رنج و غم

اِک جہاں!!!

پھر بھی میرے سوا

اے شبِ ہجرِ یاراں، تری ہچکیاں

کون سُنتا ہے

کوئی بھی سنتا نہیں.......!!!

☆

زخموں سے گوشۂ دلِ ویراں سجا لیا
ہم نے خزاں میں جشنِ بہاراں منا لیا

سورج سے چال چل کے بیاباں کی دھوپ نے
اِک بے کفن درخت کا سایہ چُرا لیا

بربادیوں کی رات! مری بے بسی تو دیکھ
گِرتے ہوئے مکاں نے مرا آسرا لیا

یاروں کا ذکر کیا کہ وفا کی تلاش میں
ہم نے تو دشمنوں کو بھی دل میں بسا لیا

آہٹ سنی ہوا کی تو محسنؔ نے خوف سے
جلتا ہوُا دِیا تہہِ داماں چھپُا لیا

☆

چاہت کا رنگ تھا نہ وفا کی لکیر تھی
قاتل کے ہاتھ میں تو حِنا کی لکیر تھی

خوش ہوں کہ وقتِ قتل مرا رنگ سرخ تھا
میرے لبوں پہ حرف دعا کی لکیر تھی

میں کارواں کی راہ سمجھتا رہا جسے
صحرا کی ریت پر وہ ہوا کی لکیر تھی

سورج کو جس نے شب کے اندھیروں میں گُم کیا
موجِ شفق نہ تھی وہ قضا کی لکیر تھی

گزرا ہے شب کو دشت سے شاید وہ پردہ دار
ہر نقشِ پا کے ساتھ رِدا کی لکیر تھی

کل اُس کا خط ملا کہ صحیفہ وفا کا تھا
محسنؔ ہر ایک سطر حیا کی لکیر تھی

☆

پھر وہی میں ہوں وہی شہر بدر سنّاٹا
مجھ کو ڈس لے نہ کہیں خاک بسر سنّاٹا

دشتِ ہستی میں شب غم کی سحر کرنے کو
ہجر والوں نے لیا رختِ سفر سناّٹا

کس سے پوچھوں کہ کہاں ہے مرا رونے والا
اِس طرف میں ہوں، مرے گھر سے اُدھر سناّٹا

تُو صداؤں کے بھنور میں مجھے آواز تو دے
تجھ کو دے گا مرے ہونے کی خبر سناّٹا

اُس کو ہنگامۂ منزل کی خبر کیا دو گے؟
جس نے پایا ہو سرِ راہگزر ۔ سناّٹا

حاصِل کُنجِ قفس، وہم بکف تنہائی!
رونقِ شامِ سفر، تا بہ سحر سناّٹا

قسمتِ شاعرِ سیماب صفت، دشت کی موت
قیمتِ ریزۂ الماسِ ہُنر سناّٹا

جانِ محسؔن مری تقدیر میں کب لکھّا ہے
ڈوبتا چاند، ترا قُرب، گجر، سناّٹا

☆

وہ دن کہاں کہ اب کوئی محفل سجایئے
اِک دل ہے سو اسی سے محبت نبھایئے

منسوب کس سے کیجیے اشکوں کے آئینے
اب کس کی راہ میں یہ خزانے لُٹایئے؟

منظر جو آنکھ میں ہے گنوا دیجیے اُسے
پتّھر جو دل پہ ہے اُسے کیسے ہٹایئے

اب کون ہے جو دے ہمیں جینے کا حوصلہ
اتنے دُکھوں میں کس کے لیے مُسکرایئے

کب تک کسی کی یاد سے رکھیے معاملہ!
آندھی میں اِک چراغ کہاں تک جلایئے

محسنؔ جو پَل میں توڑ دے صدیوں کی دوستی
اُس بے وفا کی سالگرہ کیا منایئے؟

☆

اِنکار کیا کرے گی ہَوا میرے سامنے

گھر کا ہر اِک چراغ بجھا میرے سامنے

یاد آ نہ جائے مقتلِ یاراں کی رات پھر
نیزے پہ کوئی سَر نہ سجا میرے سامنے

اُس کے خلوص میں بھی ضرورت کا رنگ تھا
وہ دے رہا تھا مجھ کو دعا میرے سامنے!

مجھ سے بچھڑ کے خط میں لکھی اس نے دل کی بات
کیوں اُس کو حوصلہ نہ ہُوا میرے سامنے؟

میرے لہُو سے تیرا لبادہ بھی تر ہُوا
اب میرا سوگ تُو نہ مَنا میرے سامنے

دل پر ہے نقش لطفِ عزیزاں کا سلسلہ
سب پر کرم وہ میرے سوا میرے سامنے

وہ جھوٹ ہی سہی مجھے یوں بھی عزیز ہے
کہنا تھا جو بھی، اُس نے کہا، میرے سامنے

جیسے میں آشنائے چمن ہی نہ تھا کبھی
گزری ہے یوں بھی آج صبا میرے سامنے

وہ لمحۂ نزولِ قیامت سہی مگر ۔۔!
اِک دن تو آئے میرا خدا میرے سامنے

کل تک جو آئینے سے بھی نازک مزاج تھا
محسؔن وہ شخص ٹوٹ گیا میرے سامنے

☆

مِل گیا تھا تو اُسے خود سے خفا رکھنا تھا
دل کو کچھ دیر تو مصروفِ دعا رکھنا تھا

میں نہ کہتا تھا کہ سانپوں سے اَٹے ہیں رستے
گھر سے نکلے تھے تو ہاتھوں میں عصا رکھنا تھا

بات جب ترکِ تعلّق پہ ہی ٹھہری تھی تو پھر
دل میں احساسِ غمِ یار بھی کیا رکھنا تھا

دامنِ موجِ ہَوا یوں تو نہ خالی جاتا
گھر کی دہلیز پہ کوئی تو دیا رکھنا تھا

کوئی جگنو تہہِ داماں بھی چھپا سکتے تھے
کوئی آنسو پسِ مژگاں ہی بچا رکھنا تھا

کیا خبر اُس کے تعاقب میں ہوں کتنی سوچیں؟
اپنا انداز تو اوروں سے جدُا رکھنا تھا

چاندنی بند کواڑوں میں کہاں اُترے گی؟
اِک دریچہ تو بھرے گھر میں کھلا رکھنا تھا

اُس کی خوشبو سے سجانا تھا جو دل کو محسنؔ
اُس کی سانسوں کا لقب موجِ صبا رکھنا تھا

☆

کب تلک اپنی دُہائی دے گا
خود سے کیا خود کو رہائی دے گا؟

آخری بار صدا دے مجھ کو!
پھر مجھے کچھ نہ سُنائی دے گا

اِسی اُمید پہ دیکھوں ہر سُو
وہ اگر ہے تو دکھائی دے گا

پھر وہ یاد آیا ہے لمحہ بھر کو
پھر وہ صدیوں کی جدُائی دے گا

دل سے کیا عذرِ محبت کیجے!
غیر کیا اپنی صفائی دے گا؟

کُنجِ قفس میں پیار کی پہلی سالگرہ

جاناں اِک پل آنکھیں کھولو!
آج کے دن تنہائی کیسی؟

دھوپ کی زردی گوشۂ زنداں میں یوُں اُتری
جیسے ایک اُداس مُسافر
دشت میں تھک کر بیٹھ گیا ہو!
آج ہوا کے ہاتھ میں سُوکھے پتّوں کا گلدستہ کیوں ہے؟
آج فضا یخ بستہ کیوں ہے؟
طوق وسلاسِل مُہر بہ لب ہیں
سنّاٹے کے بوجھل قدموں کی ہر آہٹ اندیشوں کے سیلِ رواں
میں بہتی جائے

پتھر دل کی سہمی دھڑکن!
زیرِ زباں کچھ کہتی جائے!!

''روزن'' اب تک جاگ رہا ہے

جیسے تُو آنے والی ہو!
جیسے تیرے نرم لبوں کی ریشم کرنیں
اپنے دامن میں تیری آواز سمیٹے
میری بند آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھیں اور پوچھیں ''بُوجھو!''
کس کی یاد کا لمس تمھارے گرم لبوں کو چُوم رہا ہے؟
ایک زمانہ گھوم رہا ہے

جاناں! اِک پل آنکھیں کھولو!
دیکھو آج ہمارے پیار کی پہلی سالگرہ کا
پہلا دن ہے
پہلا دن کتنا کم سِن ہے!!

دیکھو ہر سو گونج رہی ہے جذبوں کی شہنائی کیسی؟
آج کے دن تنہائی کیسی؟؟
جاناں اِک پل آنکھیں کھولو!
طوق و سلاسِل مُہر بہ لب ہیں
کچھ تو بولو!!

☆

دلوں میں اُٹھتے ہوئے دردِ بے کنار کی خیر
درِ قفس سے اُدھ شامِ انتظار کی خیر

مزاجِ طوق و سلاسل کی برہمی کو دُعا
مقامِ شوق سلامت، صلیب و دار کی خیر

تھکے تھکے ہوئے قدموں کی آہٹوں کو سلام
بجھی بجھی ہوئی اک ایک رہگزار کی خیر

خراج دینے کو آیا ہے چاندنی کا جلوس
قفس میں خاک نشینوں کے اقتدار کی خیر

کبھی جو دھوپ میں آثار آندھیوں کے بڑھے
مسافروں نے کہا، نخلِ سایہ دار کی خیر!

دکانِ شیشہ میں پتّھر سجا کے بیٹھا ہے
فقیہہِ شہر کے بے سود کاروبار کی خیر

شگفتِ گُل پہ ہیں پہرے صبا ہے خاک بَسر
چمن میں رونقِ ہنگامۂ بہار کی خیر!

کڑک رہی ہیں کمانیں عدُو کے لشکر کی
فصیلِ شہر کے خوابیدہ پہریدار کی خیر!

مزاجِ موجۂ خوشبو میں برہمی ہے بہت
قبائے حسنِ چمن تیرے تار تار کی خیر

گلاب لفظ مہکتے رہیں سدا محسنؔ!

فضائے دشتِ سخن میں ہو خار خار کی خیر!

☆

بچھڑے ہوئے یاروں کی صدا کیوں نہیں آتی
اب روزنِ زنداں سے ہَوا کیوں نہیں آتی؟

تُو اَب بھی سلامت ہے سفر میں تو مُسافرِ!
تیرے لیے ہونٹوں پہ دعا کیوں نہیں آتی

پتّھر ہو تو کیوں خوفِ شب غم سے ہو لرزاں؟
انساں ہو تو جینے کی ادا کیوں نہیں آتی

اِک پیڑ کے سائے سے ہَوا پُوچھ رہی ہے
اب دشت میں مخلوق خدا کیوں نہیں آتی؟

چہروں پہ وہ سرسوں کی دھنک کیا ہوئی یارو
ہاتھوں سے وہ خوشبوئے حِنا کیوں نہیں آتی

بستی کے سبھی لوگ سلامت ہیں تو محسؔن
آواز کوئی اپنے سوا کیوں نہیں آتی

☆

درِ قفس سے پرے جب صبا گزرتی ہے
کسے خبر کہ اسیروں پہ کیا گزرتی ہے

تعلّقات کبھی اس قدر نہ ٹوٹے تھے
کہ تیری یاد بھی دل سے کفا گزرتی ہے

وہ اب ملے بھی تو ملتا ہے اِس طرح جیسے
بُجھے چراغ کو چھُو کر ہَوا گزرتی ہے

فقیر کب کے گئے جنگلوں کی سَمت مگر
گلی سے آج بھی اُن کی صدا گزرتی ہے

یہ اہلِ ہجر کی بستی ہے، احتیاط سے چل!
مصیبتوں کی یہاں انتہا گزرتی ہے

نہ پوُچھ اپنی اَنا کی بغاوتیں محسؔن
درِ قبول سے بچ کر دُعا گزرتی ہے

☆

جن پر ستم تمام قفس کی فضا کے تھے
مجرم وہ لوگ اپنی شکستِ اَنا کے تھے

اے دشتِ خار ہم سے حسابِ کرم نہ مانگ
پاؤں میں آبلے تھے مگر اِبتدا کے تھے

لب پر سجا لیے تھے یونہی اجنبی سے نام
دل میں تمام زخم کِسی آشنا کے تھے

پتّوں سے بھر رہے تھے ہواؤں کی جھولیاں
گِرتے ہوئے شجر بھی سخی اِنتہا کے تھے

گہرے سمندروں میں کہاں عکسِ آسماں
پانی میں جتنے رنگ تھے، سارے خلا کے تھے

اب دھول اوڑھنا بھی میسّر نہیں جنھیں
وارث وہ اہلِ دل کبھی ارض و سما کے تھے

جن سے الجھ رہی تھیں ہواؤں کی شورشیں
محسنؔ وہ دائرے تو مرے نقشِ پا کے تھے

☆

بنامِ طاقت کوئی اشارہ نہیں چلے گا
اُداس نسلوں پہ اب اجارہ نہیں چلے گا

ہم اپنی دھرتی سے اپنی ہر سمت خود تلاشیں
ہماری خاطر کوئی ستارہ نہیں چلے گا

حیات اب شامِ غم کی تشبیہہ خود بنے گی
تمہاری زلفوں کا استعارہ نہیں چلے گا

چلو سروں کا خراج نوکِ سناں کو بخشیں!
کہ جاں بچانے کا اِستخارہ نہیں چلے گا

ہمارے جذبے بغاوتوں کو تراشتے ہیں
ہمارے جذبوں پہ بس تمہارا نہیں چلے گا

ازل سے قائم ہیں دونوں اپنی ضدوں پہ محسنؔ
چلے گا پانی مگر کنارہ نہیں چلے گا

☆

کچھ اس ادا سے مرے یار سر کشیدہ ہوئے
کہ فتح پا کے بھی قاتِل علَم دریدہ ہوئے

عجیب طور سے ڈوبا ہے ڈوبنے والا
کہ ساحلوں کے بگُولے بھی آبدیدہ ہوئے

جو اپنے سائے کی قامت سے خوف کھاتے ہیں
ہمارے بعد وہی لوگ برگزیدہ ہوئے

میں چپ رہا تو اُنھیں مجھ پہ اُنگلیاں کیا کیا
زباں ملی تو مرے حرف ناشنیدہ ہوئے

ہماری لاش سے گزرے تو بے خبر گزرے
وہ جن کے نام پہ ہم لوگ سربریدہ ہوئے

جنھیں غرور تھا اپنی ستمگری پہ بہت
ستم تو یہ ہے کہ وہ بھی ستم رسیدہ ہوئے

عصائے حق ہے میسّر نہ تختِ دل محسنؔ
ہم ایسے لوگ بھی کس سَن میں سِن رسیدہ ہوئے

☆

گرمِ سفر عدو کا قبیلہ دکھائی دے
منزل کا اب کوئی تو وسیلہ دکھائی دے

یاد آئیں اپنے خیمۂ ویراں کی رونقیں
صحرا مین جب کہیں کوئی ٹیلہ دکھائی دے

دیوار سنگ ہو کہ درِ گوشۂ قفس
سر پھوڑنے کو اب کوئی حیلہ دکھائی دے

شاید غبارِ رنگ میں گم ہیں حقیقتیں
ورنہ یہ آسماں کسے نیلا دکھائی دے

رویا ہے اس قدر کہ اب آنکھیں گلاب ہیں
وہ شخص روٹھ کر بھی نشیلا دکھائی دے

محسنؔ جو دے گیا مجھے سانسوں کی بانسری
فنکار کس قدر وہ سُریلا دکھائی دے

☆

میں جاں بہ لب تھا پھر بھی اصولوں پہ اَڑ گیا
بجھتا ہُوا چراغ ہواؤں سے لڑ گیا

خالی پڑے ہوئے ہیں پرندوں کے گھونسلے
ایسی ہَوا چلی کہ ہر اِک پیڑ جَھڑ گیا

کس کس کا ساتھ دے کوئی میلے کی بھیڑ میں
پھر یوں ہُوا کہ وہ بھی اچانک بچھڑ گیا

میں نے قدم بڑھائے جو صحرا کی دھوپ میں
گھبرا کے میرا سایہ میرے پاؤں پڑ گیا

اُس آئینے کے عکس ہی ٹیڑھے تھے سب کے سب
مجھ کو یہ وہم تھا مرا چہرہ بگڑ گیا

محسنؔ دلِ غریب کی ویرانیاں تو دیکھ
کیسا نگر تھا جو ترے ہاتھوں اُجڑ گیا

میرا نوحہ اِنہی گلیوں کی ہَوا لکھّے گی!

میں کہ اِس شہر کا سیماب صفت شاعر ہوں
میری تخلیق مرے فکر کی پہچان بھی ہے

میرے حرفوں مِرے لفظوں میں ہے چہرا میرا
میرا فن اب مرا مذہب مرا ایمان بھی ہے

میرؔ و غالبؔ نہ سہی، پھر بھی غنیمت جانو!
میرے یاروں کے سرہانے مرا دیوان بھی ہے

مجھ سے پوچھو کہ شکستِ دل و جاں سے پہلے
میرے احساس پہ گزری ہے قیامت کیا کیا؟

سائیہ دار و شب غم کی سخاوت سے الگ؟
میں نے سوچی قد و گیسو کی علامت کیا کیا؟

میرے ٹوٹے ہوئے خوابوں کے خرابوں سے پرے
میرے بکھرے ہوُے جذبے تھے سلامت کیا کیا؟

طنزِ اَغیار سے احباب کے اخلاص تلک
میں نے ہر نعمتِ عظمیٰ کا لبادہ پہنا!

دستِ قاتل کی کشش آپ گواہی دے گی
میں نے ہر زخمِ قبا سے بھی زیادہ پہنا

میری آنکھوں میں خراشیں تھیں دھنک کی لیکن

میری تصویر نے ملبوس تو سادہ پہنا!

ضربتِ سنگِ ملامت مرے سینے پہ سجی!
تمغۂ جُرأت و اعزازِ حکومت کی طرح

کھُل کے برسی مری سوچوں پہ عداوت کی گھٹا
آسمانوں سے اُترتی ہوئی دولت کی طرح

قریہ قریہ ہوئی رسوا مرے فن کی چاہت
کونے کونے میں بکھرتی ہوئی شہرت کی طرح

مجھ پہ کڑکی ہیں کمانیں مرے غمخواروں کی
میرے اشکوں کا تماشہ سرِ بازار ہُوا

میرے آنگن میں حوادث کی سواری اُتری
میرا دل وجہِ عذابِ در و دیوار ہُوا

عشق میں عزّتِ سادات بُھلا کر اکثر!
میر صاحب کی طرح میں بھی گنہگار ہُوا

اپنی اُجڑی ہوئی آنکھوں سے شعاعیں لے کر
مَیں نے بجھتی ہوئی سوچوں کو جوانی دی ہے

اپنی غزلوں کے سخن تاب ستارے چُن کر

سنگریزوں کی بھی آشفتہ بیانی دی ہے

حسنِ خاکِ رہِ یاراں سے محبت کر کے
میں نے ہر موڑ کو اک تازہ کہانی دی ہے

مجھ سے رُوٹھے ہیں مرے اپنے قبیلے والے
میرے سینے میں ہر اک تیرِ ستم ٹوٹا ہے

لفظ و معنی کے تقاضوں سے اُلجھ کر اکثر!
میرے ہاتھوں مرا مجروح قلم ٹوٹا ہے

کربِ ناقدرئی یاراں کے بھنور میں گھر کر
بارہا دل کی طرح شوق کا دَم ٹوٹا ہے

میں کہ اس شہر کا سیماب صفت شاعر ہوں
میں نے اِس شہر کی چاہت سے شرف پایا ہے

میرے اعداً کا غضب ابرِ کرم ہے مجھ کو
میرے حباب کی نفرت میرا سرمایہ ہے

میری بکھری ہوئی رسوائی ہے شہرت میری
میرے صحرا کی تمازت مِرا سرمایہ ہے

مطمئن ہوں کہ مجھے یاد رکھے گی دُنیا!
جب بھی اِس شہر کی تاریخِ وفا لکھے گی!

میرے گھر کے در و دیوار مجھے سوچیں گے
وسعتِ دشت مجھے آبلہ پا لکھّے گی!

میرا ماتم اسی چپ چاپ فضا میں ہو گا
میرا نوحہ اِنہی گلیوں کی ہَوا لکھّے گی

☆

چاندنی، سوچ، صدا، راہ گزر آوارہ
صورتِ گردِ سفر اہلِ سفر آوارہ

تجھ سے بچھڑا ہوں تو لگتے ہیں مجھے اپنی طرح
یہ دروبام و دل و دیدۂ تر، آوارہ

ڈوبتا دن جہاں کرنوں کے نشاں چھوڑ گیا
رات بھٹکے گی ہوں تا بہ سَحر، آوارہ

جسم کی قید نہیں، نوکِ سناں پر ہی سہی
شہر در شہر پھرے شورشِ سر، آوارہ

جب کبھی تیز ہوئی اپنے سفر کی گردش

میں نے دیکھے ہیں کئی گھومتے گھر، آوارہ

کب تلک نقشِ کفِ پائے صبا ڈھونڈھیں گے
ہم بگُولوں کی طرح شہر بدر، آوارہ!

جب ترا ہجر بھی تسکیں کے بہانے ڈھونڈے
کیوں نہ ٹھہرے مرا معیارِ نظر آوارہ

گھر سے نکلو کہ یہی رسمِ جہاں ہے محسنؔ
بے ہُنر گوشہ نشیں، اہلِ ہنر آوارہ

کب تلک یہ عذاب دیکھوں میں
گھر میں صحرا کے خواب دیکھوں میں

اِک نہ اِک نہ یہ ضد ڈبو دے گی!
سیپیاں زیرِ آب دیکھوں میں

چھین لی ظلمتوں نے بینائی
کیا سوئے آفتاب دیکھوں میں

اپنے اندر جمُود طاری ہے!
شہر میں انقلاب دیکھوں میں

روز تیری نشانیاں چاہوں!
روز اپنی کتاب دیکھوں میں

اَبر تشنہ لبی کا دُشمن ہے
ریت چمکے، سراب دیکھوں میں

جس کو پانا محال ہے محسنؔ
اُس سے ملنے کے خواب دیکھوں میں

☆

ہجر کی شب کا نشاں مانگتے ہیں
ہم چراغوں سے دھواں مانگتے ہیں

کس قدر دھوپ ہے، صحرا میں کہ لوگ
سائیہ ابرِ رواں مانگتے ہیں

جب رگِ گُل کو ہَوا چھیڑتی ہے
ہم ترا لطفِ بیاں مانگتے ہیں

شہر والے بھی ہیں سادہ کتنے
دشت میں رہ کے مکاں مانگتے ہیں

تیرا معیارِ سخاوت معلوم!
ہم تجھے تجھ سے کہاں مانگتے ہیں؟

دل سے تسکیں کی طلب ہے ہم کو
دشمنِ جاں سے اماں مانگتے ہیں

منصفِ شہر ہے برہم اس پر
لوگ کیوں اذنِ بیاں مانگتے ہیں

صحنِ مقتل سے گواہی لے لو!
سرکشیدہ ہی سناں مانگتے ہیں

آنکھ سے خونِ جگر کی خواہش؟
ہم بھی کیا جنسِ گراں مانگتے ہیں

ہم بگولوں سے بھی اکثر محسنؔ
رونقِ ہمسفراں مانگتے ہیں

☆

محبتوں پہ بہت اعتماد کیا کرنا
بُھلا چکے ہیں اُسے پھر سے یاد کیا کرنا؟

اِسی سبب سے کیا سَر سپُردِ نوک سناں
کہ جُرم بیعتِ ابنِ زیاد کیا کرنا

وہ بے وفا ہی سہی اُس پہ تہمتیں کیسی
ذرا سی بات پہ اتنا فساد کیا کرنا

کچھ اس لیے بھی میں پَسپا ہُوا ہُوں مقتل میں
کہ بہرِ مالِ غنیمت جہاد کیا کرنا

مخالفوں سے تو ممکن ہے دوستی اپنی
منافقوں سے مگر اِتحاد کیا کرنا

مسافتیں ہی پہن لیں تو منزلوں کے لیے
اب اعتبارِ رُخِ گرد باد کیا کرنا

نگاہ میں جو اُترتا ہے دل سے کیوں اُترے
دل و نگاہ میں پیدا تضاد کیا کرنا

مَیں اس لیے اُسے اب تک نہ چھوُ سکا محسنؔ
وہ آئینہ ہے اُسے سنگ زاد کیا کرنا

☆

یہ جینا کیا ہے، رسمِ جاں کنی ہے
مری ہر سانس نیزے کی اَنی ہے

کبھی سورج سوا نیزے پر اُترے
یہ کیسی برف کی چادر تنی ہے؟

ہَوا ہے یا کوئی ننگی بھکارن؟
یہ بیٹی کِس دُکھی ماں نے جنی ہے؟

مرا سایا مجھے چھاؤں نہ دے گا
مری اُس سے پُرانی دُشمنی ہے

وہ شہزادی ہے دونوں موسموں کی
بدن کندن، دوپٹہ کاسنی ہے

مری آنکھیں دکاں ہیں جوہری کی!
مرا ہر اشک ہیرے کی کنی ہے

رُخِ گُل بھیگ جائے گا یقیناً
کِرن، بادل کی چادر میں چھنی ہے

سیہ راتیں، کھلی سڑکیں سب اُس کی
ترا محسؔن مقدّر کا دھنی ہے

مَیں سوچتا ہوں!

فِراق صبحوں کی بجھتی کرنیں!
وصال شاموں کی جلتی شمعیں!!
زوال زرداب خال و خد سے اَٹے زمانے
یہ ہانپتی دھوپ، کانپتی چاندنی سے چہرے!
ہیں میرے احساس کا اثاثہ

بہار کے بے کنار موسم میں کھلنے والے
تمام پھولوں سے پھوٗٹتے رنگ،
وحشتوں میں گھرے
لبوں کے کُھلے دریچوں سے بہنے والے حروف
میری نشانیاں ہیں!

تو میرا نام نہ پوچھا کر.....!

تو میرا نام نہ پوچھا کر

میں تیری ذات کا حِصّہ ہوں
میں تیری سوچ میں شامل ہوں
میں تیری نیند کا قصّہ ہوں
میں تیرے خواب کا حاصل ہوں

میں تیری یاد کا محور ہوں
میں تیری سانس کا جھونکا ہوں
تو منظر، میں پس منظر ہوں
میں لمحہ ہوں میں جذبہ ہوں

جذبے کا کوئی نام نہیں
تو میرا نام نہ پوچھا کر!

آئینہ تو اُجلا ہے!

ہم تو کل بھی کہتے تھے
اپنے عکس کی کالک
دھل سکے تو دھو ڈالو!
عکس کی صباحت کو
''برص'' چاٹ لیتا ہے

ہم تو کل بھی کہتے تھے
اپنی ٹیڑھی آنکھوں کے
ترچھے زاویے بدلو!
زاویے جو ترچھے ہوں
مستقیم راہوں کا
کب سُراغ ملتا ہے؟
آئینے کی عظمت سے
اب حقارتیں کیسی؟
عکس سے گُریزاں ہیں
اب بصارتیں کیسی؟
اپنے آپ سے کب تک؟
یوں نظر چراؤ گے
آئینہ جو توڑو گے

خود بھی ٹوٹ جاؤ گے

☆

کبھی جو عہدِ وفا مری جاں ترے مرے درمیان ٹوٹے
میں چاہتا ہوں کی اس سے پہلے زمیں پہ یہ آسمان ٹوٹے

تری جُدائی میں حوصلوں کی شکست دل پر عذاب ٹھہری
کہ جیسے مُنہ زور زلزلوں کی دھمک سے کوئی چٹان ٹوٹے

اُسے یقیں تھا کہ اُس کو مرنا ہے پھر بھی خواہش تھی اُس کے دل میں
کہ تیر چلنے سے پیشتر دستِ دشمناں میں کماں ٹوٹے

سبھی دلیلیں سنبھال کر بھی مرے وکیلو یہ سوچ لینا
وہیں پہ میری شکست ہو گی جہاں بھی میرا بیان ٹوٹے

فنا کے ٹیلے پہ خیمۂ جاں ہَوا کے جھونکے سے یوں گرا ہے
کہ جیسے بدقسمتی سے بُزدل شکاریوں کی مچان ٹوٹے

وہ سنگ ہے تو گرے بھی دل پر وہ آئنہ ہے تو چبھ ہی جائے
کہیں تو میرا یقین بکھرے کہیں تو میرا گمان ٹوٹے

اُجاڑ بَن کی اُداس رُت میں غزل تو محسنؔ نے چھیڑ دی ہے

کسے خبر ہے کہ کس کے معصوم دل پہ اب کے یہ تان ٹوٹے؟

☆

تمام شب یونہی دیکھیں گی سوئے در آنکھیں
تجھے گنوا کے نہ سوئیں گی عمر بھر آنکھیں

طلوعِ صبح سے پہلے ہی بجھ نہ جائیں کہیں!
یہ دشتِ شب میں ستاروں کی ہمسفر آنکھیں

ستم یہ کم تو نہیں دل گرفتگی کے لیے!
میں شہر بھر میں اکیلا' اِدھر اُدھر آنکھیں

شمار اُس کی سخاوت کا کیا کریں کہ وہ شخص
چراغ بانٹتا پھرتا ہے چھین کر آنکھیں

وہ پاس تھا تو زمانے کو دیکھتی ہی نہ تھیں
بچھڑ گیا تو ہوئیں پھر سے در بدر آنکھیں

ابھی کہاں تجھے پہچاننے کی ضد کیجے!
ابھی تو خود سے بھی ٹھہری ہیں بے خبر آنکھیں

میں اپنے اشک بچاؤں گا کس طرح محسنؔ؟

زمانہ سنگ بکف ہے تو شیشہ گر آنکھیں

☆

مرے سوا سرِ مقتل مقام کس کا ہے
کہو کہ اب لبِ قاتل پہ نام کس کا ہے

یہ تخت و تاج و قبا سب اُنھیں مبارک ہوں
مگر بہ نوکِ سناں احترام کس کا ہے

تمھاری بات نہیں، تم تو چارہ گر تھے مگر
یہ جشنِ فتح پس قتلِ عام کس کا ہے؟

ہماری لاش پہ ڈھونڈو نہ اُنگلیوں کے نشاں
ہمیں خبر ہے عزیزو! یہ کام کس کا ہے

فنا کے ہانپتے جھونکے ہَوا سے پوچھتے ہیں
جبینِ وقت پہ نقشِ دوام کس کا ہے؟

تمھاری بات تو حرفِ غلط تھی، مٹ بھی گئی
اُتر گیا جو دلوں میں، کلام کس کا ہے

وہ مطمئن تھے بہت قتل کر کے محسؔن کو!

مگر یہ ذکرِ وفا صبح و شام کس کا ہے؟

☆

چوٹ گہری لگی، زخم آئے بہت
اب کے یوں تھا کہ ہم مسکرائے بہت

جس نے پردیس میں یاد رکھّا مجھے
مجھ کو اُس کا پتہ بھول جائے بہت

ہر نئے عشق کا اپنا معیار تھا
تجربے ہم نے بھی آزمائے بہت

جس میں شب بھر کو سونے کی فرصت ملے
ہم غریبوں کو بس وہ سرائے بہت

اِک تری یاد روشن رہی دیر تک
آندھیوں میں دیئے جھلملائے بہت

اِک تری دید کے شوق میں رات بھر
ہم سے اُلجھے دریچوں کے سائے بہت

اجنبی شہر کے ہر نئے موڑ پر ۔۔!
کچھ پُرانے نگر یاد آئے بہت

عکس کوئی بھی ٹھہرا نہ محسنؔ کہیں
دائرے پانیوں پر بنائے بہت

☆

خود اپنے دل میں خراشیں اتارنا ہوں گی
ابھی تو جاگ کے راتیں گزارنا ہوں گی

ترے لیے مجھے ہنس ہنس کے بولنا ہوگا
مرے لیے تجھے زلفیں سنوارنا ہوں گی

تری صدا سے تجھی کو تراشنا ہوگا
ہَوا کی چاپ سے شکلیں اُبھارنا ہوں گی

ابھی تو تیری طبیعت کو جیتنے کے لیے
دل و نگاہ کی شرطیں بھی ہارنا ہوں گی

ترے وصال کی خواہش کے تیز رنگوں سے
ترے فراق کی صبحیں نِکھارنا ہوں گی

یہ شاعری یہ کتابیں یہ آیتیں دل کی
نشانیاں یہ سبھی تجھ پہ وارنا ہوں گی

مجھے اُس سے محبت تھی.....!

مجھے اُس سے محبت تھی
کہ وہ اُس وقت میرے شہر کی بنجر زمیں پر
اَبرِ نیساں کا بدن اوڑھے
گلابی کاسنی موسم کے سارے زاویے پہنے
چھریرے سورجوں کی سات رنگوں میں نہائی
آبشاروں کی طرح بہتی، بہکتی، بولتی، بجتی شعاعوں کی سنہری
اُنگلیاں تھامے
بقا کے بام سے دوشِ ہَوا پر نقشِ پا کی دائمی خوشبو دھرے
دَم توڑتے چہروں
بجھی آنکھوں
جلے رستوں
کٹے پیڑوں کی سُوکھی ٹہنیوں کو سُرخرو موسم کی خوشخبری سُنانے
کون جانے کس بہانے آ کے اُترا تھا کہ جب
ہر سُو اُداسی اپنے خیمے نصب کر کے وحشیوں کی
بدنما دُلہن کی صورت ناچتی تھی اور

میرے شہر کی بنجر زمیں کے بے نوا باسی
اُداسی کو اَبد کی دیوداسی جان کر اپنے لہو کی نذر دینا
کارِ اوّل جانتے تھے

مانتے تھے
سب زمینوں کی جبینیں داغنے والوں کو ''اَن داتا''
سنہری بالیوں کا بانکپن جن کے بدن' کندن بناتا
اُن کے دروازوں پہ آوازوں کو دفنانے کی عادت اک
عبادت تھی!
مجھے اس سے محبت تھی
کہ اُس نے بے نوا لوگوں کے لب بستہ ضمیروں
کو جگا کر
مُدّتوں سے سر جھکا کر رینگنے والوں کو سینہ تان کر
گردن اُٹھا کر
صف بہ صف چاروں طرف نظریں گُھما کر
سب زمینوں کی جبینیں داغنے والوں کے چمکیلے گریبانوں کے
ٹانکوں میں
خود اپنے جسم کے رِستے لہوُ سے پھوٹتی چنگاریاں بھرنے
کی جُرأت کا ہُنر بخشا'
سُلگتے کھردرے ہاتھوں کی محنت کو ثمر بخشا
مجھے اُس سے محبت تھی
کہ اُس نے وہم کے جالے میں اُلجھی فاختاؤں کو
چمکتے آسمانوں کی بشارت دی
بجھی دھرتی کی شریانوں میں سہمے خون کو تازہ حرارت دی'
مجھے اُس سے محبت تھی

کہ اُس نے دار کے ماتھے پہ زخمی انگلیوں سے
زندگی کا نام لکھ کر

اپنے ''ہونے'' کا بھرم رکھّا
کہ اُس نے عہد کے سارے اندھیرے چیر کر
سچ کے سویرے میں قدم رکھّا

☆

ڈھلے گی وحشی جدائیوں کی یہ رات آخر
چلے گی اپنے وصال سورج کی بات آخر

ہماری تشنہ لبی کے تیور یہ کہہ رہے ہیں
ہمارے پاؤں پڑے گی م۔ وجِ فرات آخر

وہ پھینکتا جا رہا تھا شعلوں میں خط کسی کے
جلا دیئے اُس نے اپنے نازک سے ہات آخر

بھلا دیا تیرا ریزہ ریزہ خیال میں نے
بکھر گئی تیرے درد کی کائنات آخر

شکست کھا کر دلیر دلہن کی خودکُشی سے
پلٹ گئی اپنے اپنے گھر کو برات آخر

مجھے خود اپنی اَنا کے سونے کی جستجو تھی
گِرا دیا میں نے ذات کا سومنات آخر

یہ ہر قدم پر جو ٹھوکریں کھا رہا ہے محسنؔ
یہ شخص کھائے گا آپ اپنے سے مات آخر

☆

خالق میری خاطر یہ قربانی دے
میرے شہر کو دل جیسی ویرانی دے

کالی وحشی رات کے حبشی پیکر کو
دودھ نہائی صبحوں کی عریانی دے

سورج ہے تو دھوپ اُگا ہر جنگل میں
بادل ہے تو پیاسے پیڑ کو پانی دے

بنجر لفظ کو طَور سکھا سیلابوں کا
سُوکھے ذہن کو دریا کی طغیانی دے

میری سوچ بڑھاپے تک آ پہنچی ہے

مجھ کو پھر سے بچپن کی نادانی دے

جن کے گھر میں درد کی دولت بٹتی ہے
مجھ کو ایسے لوگوں کی دربانی دے

جن کی تہہ میں بھید اُترتے رہتے ہیں
مجھ کو ایسی آنکھوں کی حیرانی دے

محسنؔ تجھ کو یاد کرے کس ناطے سے؟
جانے والے کوئی خاص نشانی دے

☆

اگرچہ میں اِک چٹان سا آدمی رہا ہوں
مگر ترے بعد حوصلہ ہے کہ جی رہا ہوں

وہ ریزہ ریزہ مرے بدن میں اُتر رہا ہے
میں قطرہ قطرہ اُسی کی آنکھوں کو پی رہا ہوں

تری ہتھیلی پہ کس نے لِکھاّ ہے قتل میرا
مجھے تو لگتا ہے میں ترا دوست بھی رہا ہوں

کھلی ہیں آنکھیں مگر بدن ہے تمام پتّھر

کوئی بتائے میں مر چکا ہوں کی جی رہا ہوں

کہاں ملے گی مثال میری ستمگری کی؟
کہ میں گلابوں کے زخم کانٹوں سے سی رہا ہوں

نہ پوچھ مجھ سے کہ شہر والوں کا حال کیا تھا
کہ میں تو خود اپنے گھر مین بھی دو گھڑی رہا ہوں

مِلا تو بیتے دنوں کا سچ اُس کی آنکھ میں تھا
وہ آشنا جس سے مدّتوں اجنبی رہا ہوں

بھُلا دے مجھ کو کہ بے وفائی بجا ہے لیکن
گنوا نہ مجھ کو کہ میں تری زندگی رہا ہوں

وہ اجنبی بن کے اَب ملے بھی تو کیا ہے محسؔن
یہ ناز کم ہے کہ میں بھی اُس کا کبھی رہا ہوں

☆

گُم سُم سی رہگزر تھی، کنارہ ندی کا تھا
پانی میں چاند، چاند میں چہرہ کسی کا تھا

اب زندگی سنبھال کے لیتا ہے تیرا نام
یہ دل کی جس کو شوق کبھی خود کشی کا تھا

کچھ ابر بھی تھے بانجھ زمیں سے ڈرے ہوئے
کچھ ذائقہ ہَوا میں مری تشنگی کا تھا

کہنے کو ڈھونڈتے تھے سبھی اپنے خدّوخال
ورنہ مری غزل میں تو سب کچھ اُسی کا تھا

وہ احتیاط جاں تھی کہ بے ربطیٔ خیال
سائے پہ بھی گمان مجھے آدمی کا تھا

مشکل کہاں تھے ترکِ محبت کے مرحلے
اے دل مگر سوال تری زندگی کا تھا

وہ جس کی دوستی ہی متاعِ خلوص تھی
محسنؔ وہ شخص بھی مرا دشمن کبھی کا تھا

☆

ہمارے ڈوبنے والوں کو کون روتا ہے؟
کہ زیرِ آب پڑی ہیں کچھ اور لاشیں بھی!

مرے لہُو کی امانت عدو کا زہرِ ستم!
مرے بدن کا اثاثہ تری خراشیں بھی!

کہاں تلک میں پُرانے دنوں کا عشق لِکھوں؟
یہ لوگ اب کوئی تہمت نئے تراشیں بھی!

میں نے اکثر خواب میں دیکھا .....!

میں نے اکثر خواب میں دیکھا
خوف تراشے کہساروں کی گود میں جیسے
اِک پتھریلی قبر بنی ہے
قبر کی اُجلی پیشانی پر
دُھندلے میلے شیشے کی تختی کے پیچھے
تیرا نام لکھا ہے
تیرا میرا نام کہ جس میں
شیشے پتھر جیسی کوئی بات نہیں ہے
تیری شہرت میں بھی

میری رسوائی کا ہات نہیں ہے
پھر بھی!
سوچو!!
میں نے اکثر خوب میں دیکھا!!!

☆

اب کیا علاجِ زخمِ دل زار سوچنا؟
گر سوچنا بھی ہے تو سرِدار سوچنا

جب بھی چمن میں خال و خدِ یار سوچنا
ہر برگِ گل کو ریزۂ رخسار سوچنا

دل پر قیاسِ وسعتِ صحرا تراشنا
خود کو رہینِ کوچہ و بازار سوچنا

منظرؔ بظرفِ دیدۂ بے خواب باندھنا
مطلب بقدرِ فکر طرحدار سوچنا

دن بھر سخاوت لب احباب ڈھونڈنا
شب کو عطائے گیسوئے دلدار سوچنا

قطرے میں گونجتا ہو جو دریا کا بانکپن
ذرّے کو بھی اثاثۂ کہسار سوچنا

تجھ سے بچھڑ کے اب کے تو یوں ہے کہ بزم میں
بے سود بولنا کبھی بے کار سوچنا

اے اہلِ دشت آبلہ پائی کی لذّتیں!
اِک پَل کو زیرِ سائیہ دیوار سوچنا

محسنؔ لگی نا چوٹ نئی پھر خلوص میں
میں نے کہا نہ تھا کہ مرے یار سوچنا

☆

کب تک تُو اُونچی آواز میں بولے گا؟
تیری خاطر کون دریچہ کھولے گا؟

اپنے آنسو اپنی آنکھ میں رہنے دے!
ریت پہ کب تک ہیریموتی رولے گا؟

آؤ شہر کی روشنیاں ہی دیکھ آئیں!
کون ہماری خالی جیب ٹٹولے گا؟

لاکھ مرے ہونٹوں پر چُپ کی مُہریں ہوں
میرے اندر کا فنکار تو بولے گا!

دیکھ وہ اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے
اپنا سارا زہر تجھی میں گھولے گا

اے سوداگر چاہت کی جاگیروں کے!
کس میزان میں تُو اِس جنس کو تولے گا

محسنؔ اُس کی نرم طبیعت کہتی ہے!
پَل دو پَل وہ میرے ساتھ بھی ہولے گا

اَزل سے دستِ بُریدہ اُٹھائے پھرتا ہوں
(نذرِ اقبال)

مجھے خود اپنی خموشی سے کچھ گلا بھی نہیں
بھرے جہاں میں کوئی تیرا ہمنوا بھی نہیں
بہت کہوں بھی کہ زندہ ہے دل مگر اس میں
شعورِ درد و مذاقِ خودی رہا بھی نہیں

تری نگاہ تو سورج کی سجدہ گاہ بنی!
مری نگاہ مگر خود سے آشنا بھی نہیں
نئے زمان و مکاں کی نئی فضاؤں میں
گئی رُتوں کے تصّور کا نقشِ پا بھی نہیں
مجھے خود اپنے ہی اشکوں سے شرم آتی ہے
یہ کیا کہ دھوپ بھی چمکی ہے میں جلا بھی نہیں

صدائے کُن فیکُوں ہو کہ ضربِ اِلّا اللہ
وہ نیند ہے کہ کوی ذہن جاگتا بھی نہیں
تری اذانِ سحر ہو کہ دل کا نالۂ شب
کسی صدا کی سماعت کا حوصلہ بھی نہیں
وہ خامشی ہے کہ ڈرتا ہے دل دھڑکنے سے
وہ تیرگی ہے کہ جگنو کا آسرا بھی نہیں

مرے وطن کے مصّور میں تجھ سے نادم ہوں
تِرے شعور کے خاکے گنوا دِیے میں نے
مرے لبوں پہ سجایا تھا جن کو تُو نے کبھی
وہ گوُنجتے ہوے نغمے بُھلا دِیے میں نے
رواں تھا جن میں لہوُ گم شدہ زمانوں کا
کئی دنوں سے وہ بازوُ کٹا دِیے میں نے
ہوائیں جن کی صدا کیلیے ترستی ہیں
وہ لفظ گوشۂ دل میں چھپا دِیے میں نے
تری نوأ جنھیں سوزِ گلو سکھاتی تھی،
ہرے شجر سے وہ پنچھی اُڑا دِیے میں نے

میں عصرِ نوَ کا وہ ٹوٹا ہوا ستارہ ہوں
جسے نصیب ہوئی شہرِ جاں میں دربدری
میں خود مریض ہوں اعضاً تھکے ہوئے ہیں مگر
مرے بدن پر سجی ہے قبائے چارہ گری
اَزل سے دست بُریدہ اُٹھائے پھرتا ہوں
مگر مجھی سے ہے منسُوب رسمِ بخیہ گری
بدن سے برف کی چادر ہٹا نہیں سکتا
مگر مجھی سے ہے قائم وقار شُعلہ سَری

مرے وطن کے مصّور میں تجھ سے نادم ہوُں
کہ عصرِ نو کے تقاضوں میں کھو سکتا
یہ انتہا ہے مری تیرہ بختیوں کی کہ میں
خود اپنی مرگِ اَنا پر بھی رو نہیں سکتا
ترے خیال کے گہرے سمندروں کی قسم
میں اپنا داغِ جبیں تک بھی دھو نہیں سکتا

حیات بھیگتے ہونٹوں کی مسکراہٹ ہے
جنوں ضمیرِ شرر کے سوا کچھ اور نہیں!
اگر ہے روح سفر میں ازل سے تا بہ اَبد
تو جسم گردِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں
مجھے دعا کا سلیقہ نہ آسکا اب تک
کہ میں ہلاکِ سفر کے سِوا کچھ اور نہیں
میں جاں بہ لب ہوں مگر اے مرے مسیحِ نفس!
” مرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں “

☆

وہ دن کتنے اچھے تھے جب ساتھی سب سچے
تھے
سچی رُت سچ بُنتی تھی سچ کہتے سچ سُنتے تھے
سچ کے سوچ سمندر میں سچے پار اُترتے تھے
یار وہ قول ہی سچا تھا یار کھرے تو کچے تھے
ماں کی گود میں ہم نے بھی سچے حرف ہی سیکھے تھے
ہم کو سچ نے مار دیا ورنہ ہم کب ایسے تھے
اب کب تک سچ بولیں گے؟ اب تک کیا سچ سوچے تھے
جس کو سچ پہنایا تھا اُس کے زیور جھوٹے تھے
چارہ گروں کو کیا کہیے! دل کے زخم ہی گہرے تھے
اُس کی سوچ کا ذکر نہیں اس کے کپڑے اُجلے تھے
سورج پوچھتا پھرتا ہے چاند ستارے کس کے تھے؟
ساون ٹوٹ کے برسا تھا پھر بھی دریا پیاسے تھے
کس نے زلف بکھیری تھی؟ خواب مہکتے جاتے تھے
جب تک تُو نزدیک نہ تھا ہم آوارہ پھرتے تھے
محسنؔ سوُکھے پیڑوں سے
بادل کتنے اُنچے تھے

☆

سانس لیتا ہوں آگہی کے لیے
زندگی وقف ہے علیؑ کے لیے

آسماں جھک رہا ہے صدیوں سے
علم کے در پہ بندگی کے لیے!

ہجر کی شام جلنے لگتے ہیں
ماتمی داغ روشنی کے لیے

ہے ہوائے بہشت سرگرداں
کربلا کی ہر اک گلی کے لیے

ساحلوں سے اُلجھ پڑے دریا
ایک پیاسے کی دوستی کے لیے

مسکراہٹ اُداس کرتی ہے
میں تو روتا ہوں تازگی کے لیے

رہگزارِ نجف ہی کافی ہے!
ہم فقیروں کی رہبری کے لیے

جو ستم سہہ کے چُپ رہا محسنؔ
کوئی مجلس پڑھوں اُسیؑ کے لیے

☆

پل بھر کو مل کے اَجرِ شناسائی دے گیا
اِک شخص، ایک عمر کی تنہائی دے گیا

آیا تھا شوقِ چارہ گری میں کوئی مگر
کچھ اور دل کے زخم کو گہرائی دے گیا

بچھڑا تو دوستی کے اثاثے بھی بَٹ گئے
شہرت وہ لے گیا مجھے رسوائی دے گیا

کس کی برہنگی تری پوشاک بن گئی
کس کا لہو تھا جو تجھے رعنائی دے گیا

اب گِن رہا ہوں چاکِ گریباں کی دھجّیاں
دیوانگی کا شوق یہ دانائی دے گیا

تیرے بدن کا لمس کہاں یاد تھا مجھے
جھونکا ہوا کا درسِ پذیرائی دے گیا

کیونکر نہ زندگی سے زیادہ عزیز ہوُ
محسنؔ وہ زخم بھی تو مرا بھائی دے گیا

☆

زندگی بے قرار بھی تو نہیں
اب ترا انتظار بھی تو نہیں

ترکِ عہدِ وفا عذاب سہی
دل مگر شرمسار بھی تو نہیں

کس پہ افشا ہوں وحشتیں اپنی
پیرہن تار تار بھی تو نہیں

سرفرازی پہ ناز کون کرے؟
سرخرو شاخِ دار بھی تو نہیں

قافلہ کِس طرف گیا ہوگا؟
رہگزر میں غبار بھی تو نہیں

راحتیں کس حساب میں لکھیے؟
رنجشوں کا شُمار بھی تو نہیں

جانتے ہیں وہ بے وفا ہے مگر
دل پہ اب اختیار بھی تو نہیں

رنگِ عکسِ خزاں بھی کیا لینا؟
سر پہ قرضِ بہار بھی تو نہیں

دل سے رودادِ غم کہوں کیسے
دل مرا رازدار بھی تو نہیں

☆

اِک پگلی مرا نام جو لے' شرمائے بھی' گھبرائے بھی
گلیوں گلیوں مجھ سے ملنے آئے بھی' گھبرائے بھی

رات گئے گھر جانے والی گُم سُم لڑکی راہوں میں
اپنی اُلجھی زلفوں کو سُلجھائے بھی' گھبرائے بھی

کون بچھڑ کر پھر لوٹے گا' کیوں آوارہ پھرتے ہو؟
راتوں کو اِک چاند مجھے سمجھائے بھی' گھبرائے بھی

آنے والی رُت کا کتنا خوف ہے اُس کی آنکھوں میں
جانے والا دُور سے ہاتھ ہلائے بھی، گھبرائے بھی

کیا جانے وہ کون ہے محسنؔ جس کی خاطر راتوں کو
تیز ہوا پانی پر نقش بنائے بھی، گھبرائے بھی

اے چارہ گرِ امنِ دو عالَم
تو کہاں ہے؟

یہ کون سخی ہے کہ رہِ دل زدگاں میں
گُلنار ستاروں کے گہُر بانٹ رہا ہے؟
یہ کون مسافر ہے کہ شہرِ غمِ جاں میں
جاگیرِ دل و دیدۂ تر بانٹ رہا ہے
یہ مشتری جنسِ وفا کون ہے، دیکھو!
اِس دور میں جو نقدِ ہُنر بانٹ رہا ہے
اے تیرہ نصیبو اسے پوچھو کہ یہ تاجر
سودائے سَر و دردِ جگر بانٹ رہا ہے
اے کم نظرو! اس کی پرستش کہ یہ فنکار!
بے دام و درم شمس و قمر بانٹ رہا ہے

یہ کون سخنور ہے کہ قاتل کی گلی میں
زنجیر کی جھنکار سے بُنتا ہے ترانے
الہام پہ الفاظ کا ملبوس سجا کر
بھرتا ہے تہی دست خیالوں کے خزانے
آندھی میں سجائی ہیں چراغوں کی قطاریں
کہسار پہ تعمیر کیے آئینہ خانے
آنکھوں میں ستاروں کی طرح عکسِ شب و روز
مٹھی میں لکیروں کی طرح بند زمانے!
یہ دل کا کہا مان کے مسرور بھی خوش بھی
تقدیر کے فرمان کو مانے کہ نہ مانے!

یہ کون ہُنر وَر ہے کہ جس نے سرِ مقتل!
ہر دار کی ٹہنی کو کیا خون سے گُلرنگ
آفاق کی وسعت ہے اسے گوشۂ زنداں
احساس کے پیکر پہ تخیل کی قبا تنگ
ہر موجِ مئے تُند رگِ جاں کا کفارہ
ہر قطرۂ خونناب کی تابش پہ سحر دنگ
پلکوں پہ چمکتی ہوئی خاکِ رَہِ یاراں!
پابوس کی ٹھوکر پہ فرِ افسرد اورنگ

اِس خلوتیِ خاک نشینانِ وطن نے
ٹھکرا دیا ملبوسِ زر و اطلس و کمخواب
رُوٹھی ہوئی اِک صبح کی تسکین کی خاطر
تاریکیٔ شب سے بھی تراشے کئی مہتاب
دروازۂ زِنداں پہ رقم ہے یہ گواہی

آتے ہیں اِسے خانۂ زنجیر کے آداب
یہ گوشہ نشیں ہو تو صبا سے بھی گریزاں
نکلے جو سفر پر تو سمندر بھی ہیں پایاب

اے صبحِ ازل یہ ترا مجروح مئوذّن
اے شامِ اَبد یہ تری منزل کا نشاں ہے
اے مریمِ ہستی یہ ترا چشمۂ آواز!
اے روحِ مسیحا یہ ترا نطق رواں ہے
اے جذبۂ سقراطؑ ترا صدقِ مکمل!
اے حکمتِ لقمان یہ سرمائیہ جاں ہے
گو بارشِ سنگ اس پہ برستی رہی پھر بھی
یہ رونقِ صد انجمنِ شیشہ گراں ہے
سو بار یہ مصلوب ہُوا ہے سرِ بازار
پھر بھی سخن آشفتہ بخوں زیرِ زباں ہے
اے نوعِ بشرؑ اس کی جراحت کا مداوا
اے عظمتِ آدمؑ یہ ترا مرثیہ خواں ہے
دم توڑ رہا ہے ترے خوابوں کا پیمبر
اے چارہ گرِ اَمنِ دو عالم تو کہاں ہے؟

☆

وہ ماہتاب جو ڈوبا ہُوا ملال میں تھا

مجھے خبر ہی نہیں ہے میں کس خیال میں تھا

شکست کھا کے بھی میں سُرخرو سا لگتا ہوں
کہ دوستی کا مزا دشمنوں کی چال میں تھا

خراش تھی مِرے رُخ پر کہ وہم آنکھوں میں؟
تمام بھید ترے آئینے کے بال میں تھا

عُروجِ نوکِ سناں جب ہُوا نصیب مجھے
فلک پہ کانپتا سُورج حدِ زوال میں تھا

میں ٹوٹتے ہوئے پتّے سنبھالتا کب تک
کہ زرد زہر تو پیڑوں کی ڈال میں تھا

ترا خلوص پرکھنے کا وقت ہی نہ مِلا
کہ میں اسیر تری نفرتوں کے جال میں تھا

کب اُس نے ٹُوٹ کے چاہا تھا یوں مجھے محسنؔ
یہ معجزہ بھی نہاں اب کے ماہ و سال میں تھا

☆

بظاہر لوگ کتنے مہرباں تھے
مگر دُکھ بانٹنے والے کہاں تھے

لبوں پر مُسکراہٹ کی دھنک تھی
لہُو لتھڑے سخن زیرِ زُباں تھے

جو منزل آشنا تھے وہ مُسافر!
پسِ خاکِ غبار کارواں تھے

میں ایسے شہر کا باسی تھا جس میں
مکیں پتّھر تھے، شیشے کے مکاں تھے

جلا جب آشیاں تو ہم نے جانا
کہ تنکے بھی ہوا کے رازداں تھے

کسی نے حال تک پُوچھا نہ محسنؔ
ہم اہلِ دل بھی کتنے رائیگاں تھے

☆

زُباں رکھتا ہوں لیکن چُپ کھڑا ہوں

میں آوازوں کے بَن میں گھِر گیا ہوں

مِرے گھر کا دریچہ پوُچھتا ہے!
میں سارا دن کہاں پھرتا رہا ہوں؟

مجھے میرے سوا سب لوگ سمجھیں
میں اپنے آپ سے کم بولتا ہوں

ستاروں سے حسد کی انتہا ہے
میں قبروں پر چراغاں کر رہا ہوں

سنبھل کر اب ہواؤں سے اُلجھنا
میں تجھ سے پیشتر بجھنے لگا ہوں

مِری قربت سے کیوں خائف ہے دُنیا
سمندر ہوُں میں خُود میں گوُنجتا ہوں

مجھے کب تک سمیٹے گا وہ محسنؔ؟
میں اندر سے بہت ٹوٹا ہوا ہوں

☆

چہرے پڑھتا، آنکھیں لکھتا رہتا ہوں
میں بھی کیسی باتیں لکھتا رہتا ہوں؟

سارے جسم درختوں جیسے لگتے ہیں
اور بانہوں کو شاخیں لکھتا رہتا ہوں

تجھ کو خط لکھنے کے تیور بھُول گئے
آڑی ترچھی سطریں لکھتا رہتا ہوں

تیرے ہجر میں اور مجھے کیا کرنا ہے؟
تیرے نام کتابیں لکھتا رہتا ہوں

تیری زُلف کے سائے دھیان میں رہتے ہیں
میں صُبحوں کو شامیں لکھتا رہتا ہوں

اپنے پیار کی پھول مہکتی راہوں میں
لوگوں کو دیواریں لکھتا رہتا ہوں

تجھ سے مِل کر سارے دُکھ دُہراؤں گا
ہجر کی ساری باتیں لکھتا رہتا ہوں

سوُکھے پھول، کتابیں، زخم جُدائی کے

تیری سب سوغاتیں لکھتا رہتا ہوں

اُس کی بھیگی پلکیں ہنستی رہتی ہیں
محسنؔ جب تک غزلیں لکھتا رہتا ہوں

☆

حَسیں لگتا تھا ہم نے جِن دنوں میں اُس کو دیکھا تھا
بسنتی موسموں، بھیگی رُتوں میں اُس کو دیکھا تھا

اُسی کے عکس نے آنکھیں خمارِ خواب سے بھر دیں
چمکتے چاند جیسے آئینوں میں اُس کو دیکھا تھا

جسے اب ریت کے کچّے گھروندوں سے محبت ہے
سمندر کے سنہرے پانیوں میں اُس کو دیکھا تھا

جو تنہائی کی چادر اوڑھ کر سوتا ہے رستوں میں
کبھی اِس شہر کی سب محفلوں میں اُس کو دیکھا تھا

بگولوں کو پہن کر اب جو صحرا میں بھٹکتا ہے
گُلاب و یاسمن کے جنگلوں میں اُس کو دیکھا تھا

جو اپنے قریۂ دل کی اُداسی سے بہلتا ہے
گھٹاؤں میں گھِری گُم بستیوں میں اُس کو دیکھا تھا

ضرورت ہے جسے اب دُھوپ کا اُجلا کفن محسنؔ
بدن پر برف اوڑھے پربتوں میں اُس کو دیکھا تھا

☆

اس حبسِ بے خلل کی اَدا پر نہ جائیو!
اب گھر کے بام و دَر بھی سنبھل کر سجائیو

تُو حیرتوں کی زد میں گھِری موجِ کم شناں
میں سیلِ بے کنار، مرے مُنہ نہ آئیو!

آنکھوں میں ایک اشک ہے باقی ہوائے شام
یہ آخری دیا ہے، اِسے مت بجھائیو!

ہونا ہیں آسماں سے ''شہابوں'' کی بارشیں
گر ہو سکتے تو گھر کا اندھیرا بچائیو

یا عام کیجیو نہ جنوں کی حکایتیں!
یا شہر چھوڑ دیجیو، صحرا بسائیو!

ہر شخص کب سنبھال سکے گا متاعِ درد؟
ہر شخص کو نہ اپنی کہانی سُنائیو!

محسنؔ دیارِ ہجر میں لازم ہے احتیاط
رستہ کٹھن سہی، کہیں ٹھوکر نہ کھائیو

☆

محبتوں میں اذّیت شناز کتنی تھیں!
بچھڑتے وقت وہ آنکھیں اُداس کتنی تھیں!

فلک سے جن میں اُترتے ہیں قافلے غم کے
مری طرح وہ شبیں اُس کو راس کتنی تھیں

غلاف جن کی لحد پر چڑھائے جاتے ہیں
وہ ہستیاں بھی کبھی بے لباس کتنی تھیں؟

بچھڑ کے تجھ سے کسی طور دِل بہل نہ سکا

نِشانیاں بھی تری میرے پاس کتنی تھیں!

اُتر کے دل میں بھی آنکھیں اُداس لوگوں کی
اسیرِ وہم و رہینِ ہراس کتنی تھیں!

وہ صورتیں جو نکھرتی تھیں میرے اشکوں سے
بچھڑ کے پھر نہ ملیں ناسپاس کتنی تھیں

جو اُس کو دیکھتے رہنے میں کٹ گئیں محسنؔ
وہ ساعتیں بھی محیطِ حواس کتنی تھیں

☆

یہ سال بھی اُداس رہا رُوٹھ کر گیا
تجھ سے ملے بغیر دسمبر گزر گیا

عُمرِ رَواں خزاں کی ہوَا سے بھی تیز تھی
ہر لمحہ برگِ زرد کی صورت بکھر گیا

کب سے گھرا ہوُا ہوُں بگولوں کے درمیاں؟
صحرا بھی میرے گھر کے دروبام پر گیا

دل میں چٹختے چیختے وہموں کے بوجھ سے

وہ خوف تھا کہ رات مَیں سوتے میں ڈر گیا

جو بات معتبر تھی وہ سر سے گزر گئی!
جو حرف سرسری تھا وہ دل میں اُتر گیا

ہم عکسِ خونِ دل ہی لُٹاتے پھرے مگر
وہ شخص آنسوؤں کی دھنک میں نکھر گیا

کیا دشمنی تھی چاند کو گھر کے چراغ سے؟
گھر بُجھ گیا تو چاند ندی میں اُتر گیا

محسنؔ یہ رنگ رُوپ یہ رونق بجا مگر
میں زندہ کیا رہوں کہ مِرا جی تو بھر گیا

اِس سے پہلے کہ ہم•••••!

اس سے پہلے کہ ہم
اپنے اپنے سفر کا ارادہ کریں

اس سے پہلے کہ سوُرج کی پہلی کرن
شب کی شہ رگ میں پھیلے ہوئے زہر میں ڈوب کر
دل کی دھڑکن کو ڈسنے لگے

اس سے پہلے کہ آنکھوں پہ ہر سمت سے
ہجر کا کرب کا جل برسنے لگے

اس سے پہلے کہ نیندوں کی ویراں سرائے میں سوئے ہوئے

خواب ڈرنے لگیں
اس سے پہلے کہ ہم
اپنے اپنے اندھیرے کی تنہائیوں میں اُترنے لگیں
(فکرِ شام وصحر سے گزرنے لگیں)
آؤ اپنے گزشتہ شب وروز کی دُھوپ چھاؤں سے
مہکے ہوئے موڑ پر

گردِ رنج والم سے اَٹی سیپیاں
''درگزر'' کی دبی خواہشوں سے بھریں
کھل کے باتیں کریں!!
آخری بار اِک دوسرے کے لیے
اپنے دیدہ و دل کے اُفق پر رَقم حرفِ سادہ کریں
آخری بار اشکوں سے دل میں چراغاں
زیادہ کریں

اِس سے پہلے کہ ہم
اپنے اپنے سفر کا ارادہ کریں!!